تین ننھے جاسوس
بھوت محل میں
یہ تین ننھے سراغ رساں سیریز کا سب سے پہلا ترجمہ کیا گیا ناول ہے (احسان الحق)
مقبول جہانگیر
Ferozsons Limited
فیروز سنز

تین ننھے سراغ رساں

بھوت محل میں

مقبول جہانگیر

فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ

پہلی بار	۱۹۷۷
تعداد	۴۰۰۰
قیمت	۴روپے

تین سراغ رساں

ہیڈ کوارٹر میں خفیہ جلسہ ہو رہا تھا۔ تینوں ننھے سراغ رساں آمنے سامنے بیٹھے اس ملاقاتی کارڈ کے ڈیزائن پر غور کر رہے تھے جو انہوں نے اپنا تعارف کرانے کے لیے چھپوائے تھے۔ ان سراغ رسانوں کا ہیڈ کوارٹر عنبر کے گھر میں تھا اور وہی اس جماعت کا سراغ رساں نمبر ایک مقرر ہوا تھا۔ دوسرا سراغ رساں نسیم اور تیسرا عاقِب تھا۔

عنبر کا جسم دبلا پتلا اور قد لمبا تھا۔ ذہانت اس کی چمکیلی آنکھوں سے ٹپکتی تھی اور

جب وہ کسی گتھّی کو سلجھانے میں مصروف ہوتا تو ہمیشہ اپنے نچلے ہونٹ کو ناخن سے نوچتا رہتا تھا۔ یہ اس کی عادت تھی۔ وہ جب بھی اپنا ہونٹ اچانک نوچنے لگے تو سمجھ لیجیے کہ جاسوس نمبر ایک کا دماغ کوئی انوکھا مسئلہ، کوئی نرالہ معمّا یا کوئی پراسرار گتھی سلجھانے میں مصروف ہے اور واقعی وہ بہت دور کی کوڑی لاتا تھا۔ اسکول اور پاس پڑوس میں اس کی ذہانت، معلومات اور ہوشیاری کے بہت سے قصّے مشہور تھے۔ وہ کہتا تھا کہ مشکل سے مشکل مسئلہ اور انوکھی سے انوکھی گتھی عقل کو کام میں لاکر آسانی سے سلجھائی جاسکتی ہے۔ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں وہ ایسی دلیلیں دیتا کہ کسی کو انکار کی مجال نہ تھی۔

کچھ عرصہ پہلے نسیم سراغ رساں نمبر دو کی والدہ کی ایک قیمتی انگوٹھی گھر ہی میں کہیں گم ہوگئی تھی۔ انہوں نے انگوٹھی کی تلاش میں سارا گھر چھان مارا، لیکن وہ نہ ملی۔ آخر مایوس ہو کر بیٹھ رہیں۔ نسیم نے انگوٹھی کھو جانے کا ذکر اپنے دوست عنبر سے کیا۔ وہ نسیم کے گھر آیا اور اس کی ماں سے انگوٹھی کے بارے میں چند سوالات کرنے کے بعد اطمینان سے اٹھا، گھر کے سٹور میں گیا اور وہاں ایک کنستر

کے پیچھے سے انگوٹھی نکال کر ان کے حوالے کر دی۔ نسیم کے گھر والے یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ اس کی والدہ کو تو کسی طرح یقین نہ آتا تھا کہ انگوٹھی مل گئی ہے۔

بعد میں عنبر نے ہنستے ہوئے انہیں بتایا کہ وہ جب سٹور میں کسی چیز کی ضرورت کے لیے گئی تھیں تبھی انگوٹھی ان کی انگلی سے گر گئی تھی۔

انہی دنوں کاریں بیچنے والی ایک کمپنی نے اسکول میں پڑھنے والے طالب علموں کے درمیان ذہنی آزمائش کے ایک مقابلے کا انتظام کیا تھا۔ اس مقابلے میں معلوماتِ عامہ کے ایک سو سوالوں کا صحیح جواب دینے والے طالبِ علم کو ایک مرسیڈیز کار ڈرائیور سمیت، ایک ماہ کے لیے دی جاتی تھی، تاکہ وہ اس کار پر جہاں جی چاہے سیر و تفریح کے لیے جا سکے۔ پٹرول اور دوسرے اخراجات بھی کمپنی ہی کے ذمّہ تھے۔

ہزاروں ذہین طالبِ علموں نے اس مقابلے میں حصّہ لیا، لیکن عنبر کے سوا کوئی بھی ان سوالوں کے صحیح جواب نہ دے سکا اور اس نے آخر کار یہ مقابلہ جیت لیا۔

اس مقابلے کی خبریں، عنبر کی تصویروں کے ساتھ، تمام اخباروں میں شائع ہوئی تھیں اور اب وہ شان دار مرسیڈیز کار ڈرائیور سمیت ایک ماہ کے لیے عنبر کی خدمت میں حاضر تھی۔

سراغ رساں نمبر دو نسیم کی عمر بارہ تیرہ برس کی ہو گی۔ وہ نہایت دلیر، چُست چالاک اور ہوشیار لڑکا تھا۔ ذہانت میں سُراغ رساں نمبر ایک سے دوسرے درجے پر تھا۔ اس کی باتیں بڑی دل چسپ ہوتی تھیں اور وہ ہر بات میں ہنسی کا کوئی نہ کوئی ذریعہ ڈھونڈ ہی لیتا تھا۔ تیسرا سراغ رساں عاقِب بھی اتنی ہی عُمر کا تھا۔ اُسے جاسوسی اور جان جوکھوں کے کاموں کے علاوہ ہر قسم کی کتابیں پڑھنے سے بھی لگاؤ تھا۔ اس کی یادداشت بہت عمدہ تھی اور وہ معلومات کا بڑا خزانہ اپنے دماغ میں محفوظ رکھتا تھا۔ دونوں بڑے سراغ رسانوں نے طے کیا تھا کہ جتنی مہمیں وہ سر کریں گے، ان کا ریکارڈ رکھنا عاقِب کی ذمّے داری ہو گی، اور عاقِب نے یہ ذمّے داری بڑی خوشی سے قبول کرلی تھی۔

"ملاقاتی کارڈ کا ڈیزائن تو بہت عمدہ ہے۔" نسیم نے خوش ہو کر کہا۔ "چھپائی بھی

اچھی ہے اور کاغذ بھی مہنگا لگایا ہے۔"

"ہاں، کارڈ چھپواتے وقت میں نے خاص طور پر اس بات کا خیال رکھا تھا کہ چھپائی اچھی ہو اور کاغذ بھی نفیس استعمال کیا جائے۔" عنبر نے کہا۔ "یاد رکھو! ملاقاتی کارڈ اچھا نہ ہو تو دوسروں پر اس کا بُرا اثر پڑتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں جیسا گھٹیا ملاقاتی کارڈ ہے ویسا ہی یہ آدمی بھی ہو گا۔"

"بے شک، ہمیں اپنے بارے میں دوسروں پر بُرا اثر نہیں چھوڑنا چاہیے۔" عاقِب نے رائے ظاہر کی۔ پھر کارڈ ہاتھ میں لے کر اسے غور سے دیکھنے لگا۔ اس پر لکھا تھا:

تین سُراغ رساں

ہم مشکل سے مشکل گتھیاں سلجھا سکتے ہیں

؟؟؟

سراغ رساں نمبر ایک: عنبر

سراغ رساں نمبر دو: نسیم

سراغ رساں نمبر تین عاقِب

عاقِب کی بھویں آہستہ آہستہ سکڑنے لگیں اور ہونٹ بھینچ گئے۔ عنبر نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے تمہارے ذہن میں یہ کارڈ دیکھ کر کوئی الجھن پیدا ہو رہی ہے۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی؟“

”ہاں۔۔۔یہی بات ہے۔“ عاقِب نے جواب دیا۔ ”اس کارڈ پر جو کچھ لکھا ہے، وہ تو بالکل ٹھیک ہے، لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا کہ آخر ان تین بڑے بڑے سوالیہ نشانوں کا کیا مطلب ہے؟“

”یہی خیال مجھے بھی پریشان کر رہا ہے۔“ نسیم نے کہا۔

”بھئی، یہ تو بڑی آسان بات ہے۔“ عنبر نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ”یہ ایک بین الاقوامی اشارہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کوئی بات حل طلب ہے۔ کوئی

ایسی گتھّی ہے جو سلجھنے میں نہیں آ رہی اور چوں کہ ہم بھی ایسی گتھیوں اور معمّوں کی تلاش میں ہیں، اس لیے ہماری بات کو واضح کرنے کے لیے یہ تین سوالیہ نشان ضروری ہیں۔ ہم تین سراغ رساں ہیں اور ہر ایک کے لیے یہ نشان علامت کا کام دے گا۔ اس کے علاوہ ایک اور اہم بات یہ ہے کہ جو شخص بھی یہ ملاقاتی کارڈ دیکھے گا، وہ چند لمحے اس پر توجّہ ضرور دے گا کہ آخر ان سوالیہ نشانوں کے ذریعے کس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، جیسا کہ تم دونوں کے دل میں بھی اسی الجھن نے جنم لیا۔ پھر یہ بھی ہے کہ ان سوالیہ نشانوں کی وجہ سے لوگ ہمیں فوراً پہچان لیا کریں ہے کہ یہی وہ تینوں نام ور سراغ رساں ہیں جو پراسرار گتھیاں اور معمّے حل کیا کرتے ہیں۔ غرض اس کے بڑے فائدے ہیں۔"

"ہاں، بشرطیکہ ہمیں کوئی پُراسرار معاملہ حل کرنے کے لیے ملے۔" نسیم نے منہ بنا کر کہا۔ "فی الحال تو میں دُور دُور تک دیکھ آیا ہوں۔ کوئی ایسا کیس نظر نہیں آتا جس میں ہماری یا لوگوں کی دل چسپی کا کوئی سامان موجود ہو۔"

"کیا واقعی؟" عنبر نے اس کی طرف غور سے دیکھ کر کہا "میرا خیال ہے، اگر ہم

اِدھر اُدھر پوچھ گچھ کریں تو کوئی نہ کوئی عجیب واقعہ پیچیدہ کیس ہمیں ضرور مل جائے گا۔ بس ہماری شہرت کے لیے ایک ہی ایسا معمّا بہت ہے جو آج تک حل ہونے میں نہ آیا ہو۔ مثلاً کوئی ایسا ویران محل جس پر مدّت سے بھُوتوں نے قبضہ کر رکھا ہو۔ ہم اس محل میں جائیں، ایک یا دو راتیں وہاں رہیں اور دیکھیں کہ واقعی جن بھوت یا بد روحیں ہوتی ہیں یا یوں ہی لوگوں نے قصّے کہانیاں گھڑ رکھی ہیں۔"

"ویران محل! بھوت!" عاقِب ایک دم چلّایا۔ "خدا کی پناہ! میں تو بھُول ہی گیا تھا۔ ہمارے اپنے شہر شاداب نگر میں ایک ویران محل موجود ہے اور اس میں بھُوت بھی رہتے ہیں۔"

عنبر اور نسیم دونوں اپنی اپنی کرسیوں پر سنبھل کر بیٹھ گئے اور عاقِب کی طرف تکنے لگے۔ "کئی دن ہوئے میں نے ایک رسالے میں اس ویران محل کے بارے میں ایک دلچسپ مضمون پڑھا تھا۔ یہ اپنے زمانے کے ایک مشہور فلم ایکٹر ضیغم خاں نے تعمیر کروایا تھا۔ ضیغم خان اس زمانے میں فلموں میں کام کرتا تھا جب

فلموں میں آواز نہیں ہوا کرتی تھی۔" "گونگی فلمیں کہتے تھے انہیں۔" عنبر نے لقمہ دیا۔

"ہاں، وہ گونگی فلموں کا زمانہ تھا اور ضیغم خاں اکثر خوف ناک فلموں میں جن، بھوت کا پارٹ کیا کرتا تھا۔ اپنے فن میں اس کا کوئی ثانی نہ تھا۔ لوگ اُسے سنیما کے پردے پر دیکھتے ہی خوف سے کانپنے لگتے تھے۔ جب وہ خون پینے والی بلا کے بھیس میں آتا تو ڈر کے مارے کم زور دل آدمیوں کی چیخ نکل جاتی تھیں۔

شاداب نگر کے جنوبی حصّے کی طرف، جہاں چھوٹی چھوٹی چٹانیں اور پہاڑیاں ہیں اور کچھ فاصلے پر سمندر ہے، وہی ایک جگہ ڈھونڈ کر ضیغم خاں نے ایک شان دار محل بنوایا۔ محل کیا، اچھا خاصا بھوت گھر تھا۔ ضیغم خاں نے اس محل میں عجیب عجیب ڈراؤنی چیزیں جمع کی تھیں۔ مثال کے طور پر مردہ انسانوں کی کھوپڑیاں، بڑی بڑی چمگادڑیں، بھُس بھرے ہوئے خوف ناک شکلوں کے بھیڑیے، مصر کے پرانے مقبروں سے لائی گئی کفن میں لپٹی ہوئی ہزاروں سال قدیم لاشیں، جنہیں ممی کہا جاتا ہے۔ پھر افریقہ اور برازیل کے تاریک جنگلوں میں رہنے

والے بونے جادوگروں سے حاصل کی ہوئی بے شمار ایسی چیزیں جنہیں دیکھ کر بدن پر کپکپی طاری ہو جائے۔ ضیغم خاں نے اپنے محل کی یہ چیزیں حاصل کرنے میں بہت رقم خرچ کی تھی۔۔۔"

"ہاں، اب مجھے بھی یاد آ گیا۔" نسیم نے اُچھل کر کہا۔ "ایک مرتبہ اُن پہاڑیوں کے قریب سے گزرتے ہوئے وہ محل میں نے بھی دیکھا تھا، لیکن اس وقت وہ خالی پڑا تھا اور ابّا جان نے مجھے بتایا تھا کہ بہت عرصے سے یہ ویران پڑا ہے اور اس میں بد روحوں نے ڈیرا جما لیا ہے۔ کوئی شخص دن کے اجالے یا رات کے اندھیرے میں اس کے اندر جانے کی جرأت نہیں کرتا۔"

"بہت خوب! یہ تو بہت دل چسپ داستان ہے۔" عنبر نے خوشی سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ "ذرا تفصیل سے بتاؤ کہ یہ محل ویران کیوں ہوا اور اس کا مالک ضیغم خاں کہاں گیا؟"

"وہی تو بتا رہا ہوں۔" عاقِب جلدی سے بولا۔ "جب گونگی فلموں کا زمانہ ختم ہوا اور بولنے والی فلمیں ایجاد ہوئیں تو ضیغم خان کو فلموں میں کام ملنا بند ہو گیا۔ اس

کی شاید ایک وجہ یہ تھی کہ ضیغم خان کی آواز بہت باریک اور بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ تو بس گونگی فلموں ہی میں خوب سجتا تھا۔ بولتی فلموں میں لوگوں نے خوف ناک جن کے رُوپ میں اُسے دیکھا تو ڈرے، لیکن جب اس کی باریک، بیٹھی ہوئی زنانہ آواز سُنی تو قہقہوں کے مارے سنیما ہال کی چھت سر اُٹھالی۔ اور یُوں ضیغم خان کی تمام شہرت آہستہ آہستہ خاک میں مل گئی۔ جوں ہی لوگ فلموں میں اسے دیکھیے، قہقہے لگانے شروع کر دیتے۔ وہ ضیغم خاں جو فلموں میں پڑے ڈراؤنے کردار ادا کرتا تھا اور جسے دیکھتے ہی ہر شخص پر دہشت چھا جاتی تھی۔ اب فلم دیکھنے والوں کی نگاہ میں ایک حقیر اور معمولی اداکار بن گیا۔ ظاہر ہے اس بات کا اُسے بے حد رنج ہوا اور اس نے فلموں میں کام نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔"

"اس کے علاوہ وہ بے چارہ کر بھی کیا سکتا تھا۔" نسیم نے ہنس کر کہا۔ "اس کی آواز ہی نے اس کا ساتھ نہ دیا۔"

"کہانی سننے دو۔ بیچ میں مت بولو۔" عنبر نے اسے ڈانٹا۔ پھر عاقب سے کہا۔ "تم اپنا بیان جاری رکھو۔"

”میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، وہ صرف حافظے کی مدد سے کہہ رہا ہوں۔“ عاقب نے بتایا۔ ”تمام واقعات مجھے یاد نہیں وہ رسالہ گھر میں تلاش کروں گا، پھر سب تفصیل معلوم ہو گی۔ اتنا اور سُن لو کہ ضیغم خان نے جب فلمی دنیا۔ اُکتا کر ریٹائر ہونے کا فیصلہ کیا تو وہ بے حد رنجیدہ تھا۔ اس نے گھر کے تمام نوکروں کو نکال دیا، یہاں تک کہ کہ اُس نے اپنے ایک مخلص دوست، شاہ باز خاں کو بھی رُخصت کر دیا جو اس کا سیکرٹری بھی تھا۔ ہوتے ہوتے ضیغم خان نے خطوں کے جواب دینے بھی بند کر دیے اور کچھ عرصے بعد ٹیلے فون بھی کٹوا دیا۔ سارا سارا دن وہ اپنے محل کی ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں پڑا رہتا۔ لوگ بھی آہستہ آہستہ اسے بھول گئے۔ اب کوئی ضیغم خاں کو بھولے سے بھی یاد نہ کرتا تھا۔“

”تعجّب ہے کہ ایسا مشہور آدمی اور یوں گُم نام ہو جائے۔“ عنبر نے کچھ سوچتے ہوئے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

”پھر یہ ہوا کہ ایک دن نگار آباد سے کوئی پچیس میل دور جنوب میں ایک ٹوٹی پھوٹی کار کے کچھ حصّے پڑے پائے گئے۔ تمہیں معلوم ہے نگار آباد کو جو سڑک

جاتی ہے وہ سمندر کے قریب پہاڑیوں میں سے گزرتی ہے اور زمین سے خاصی اونچی ہے۔ اس سڑک پر بہت سے خطرناک موڑ بھی آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کاروں پر سفر کرنے والے اس سڑک پر نہایت احتیاط سے گاڑیاں چلاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک خطرناک موڑ سے گزرتے ہوئے ڈرائیور نے کار کی رفتار دھیمی نہیں کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کار بے قابُو ہو کر سڑک سے گری اور چٹانوں سے ٹکراتی ہوئی سمندر میں جا گری۔ اس دوران میں کار کا ایک دروازہ اور اگلا مڈ گارڈ ٹوٹ کر سڑک ہی پر رہ گیا تھا۔ انھی چیزوں سے کار کے ڈرائیور یا مالک کا سراغ لگانے میں پولیس کو آسانی ہوئی۔"

"ضیغم خان کا کیا حشر ہوا؟" نسیم نے پوچھا۔ "صاف ہے کہ وہی اس کار میں کہیں جا رہا تھا۔"

"ہاں، وہ کار ضیغم خان ہی کی تھی۔" عاقِب نے جواب دیا۔ "لیکن پولیس کی سر توڑ کوشش کے باوجود اس کی لاش سمندر میں سے نکالی نہ جا سکی۔ سمندر سے لاش نکالنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ ہو سکتا ہے ضیغم خان کی لاش سمندری

طوفان میں بہہ کر سینکڑوں ہزاروں میل دور پہنچ گئی ہو۔"

"یا پھر اسے شارک مچھلیوں نے ہڑپ کر لیا ہو۔" نسیم نے پھر لُقمہ دیا۔ "میں نے سنا ہے کہ شارک مچھلیاں آناً فاناً انسان کو ہڑپ کر جاتی ہیں۔"

"یار، تم بھی عجیب احمق ہو۔" عنبر نے پھر اسے ڈانٹا۔ "اس وقت شارک مچھلیوں پر بحث کرنے کی کیا تُک ہے؟ ذکر ہو رہا ہے ضیغم خان کی کار کے حادثے اور اس کی لاش کا اور تم بیچ میں شارک مچھلیوں کو لے آئے۔ ہاں عاقب، آگے کیا ہوا؟"

"پولیس کے سراغ رسانوں کو شُبہ ہوا کہ یہ حادثہ اتفاقی نہیں تھا، بلکہ ضیغم خاں نے جان بوجھ کر اپنی کار سمندر میں گرا کر خود کو ہلاک کر لیا ہے۔ یعنی یہ واردات خودکشی کی ہے۔ یہ شبہ ہوتے ہی پولیس والے ضیغم خاں کے محل کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں جا کر انہوں نے دیکھا کہ سب دروازے چوپٹ کھلے پڑے ہیں۔ محل میں اس وقت کوئی نہ تھا۔ پولیس افسروں نے تمام کمرے دیکھے بھالے۔ آخر لائبریری میں ایک میز پر انہیں ضیغم خاں کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک پرچہ دکھائی

دیا۔ اس پرچے پر نہایت دل چسپ عبارت لکھی تھی۔"

"کیا عبارت تھی وہ؟ کچھ یاد ہے؟" عنبر نے بے چینی سے پوچھا۔

"وہ عبارت بھُلائی نہیں جا سکتی۔" عاقب نے جواب دیا۔ "اس کاغذ پر لکھا تھا: میں اس دنیا سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو رہا ہوں۔ اب کوئی شخص مجھے دوبارہ نہ دیکھ سکے گا۔۔ لیکن یاد رکھو۔۔۔ میری روح ہمیشہ اس محل میں رہے گی اور یہاں سے کبھی نہ جائے گی۔۔۔ جو کوئی اس محل میں داخل ہو گا۔۔۔ وہ پریشان ہو کر بھاگ جائے گا۔۔۔ میری روح اسے کبھی یہاں ٹھہرنے نہ دے گی۔۔۔ ضیغم خاں۔"

"خدا کی پناہ!" نسیم نے خوف سے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔ "میرے باپ کی توبہ! جو میں کبھی اس محل میں جاؤں۔"

"خیر، تم جاؤ یا نہ جاؤ۔ میں ضرور جاؤں گا۔" عنبر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "مجھے اس قسم کے بھوت محل بہت پسند ہیں۔ بہت دنوں سے میری خواہش تھی کہ کسی ایسی جگہ کا پتا چلے جہاں بھوت اور بد روحیں رہتی ہوں۔ بہر حال، پھر کیا

ہوا؟“

”اس کے بعد ہوا یہ کہ محل کی تلاشی لینے کے دوران میں پولیس افسروں پر اچانک خوف طاری ہو گیا۔ محل کے پراسرار کمروں میں سے عجیب عجیب ڈراؤنی آوازیں آنے لگیں اور بعض پولیس افسروں کو سائے سے گھومتے پھرتے بھی دکھائی دیے۔ چنانچہ وہ سر پر پاؤں رکھ کر وہاں سے بھاگے اور دوبارہ ضیغم خاں کے محل میں قدم رکھنے کی جرأت نہ کی۔

پھر کچھ عرصے بعد معلوم ہوا کہ ضیغم خاں نے جب یہ شان دار محل بنوایا تھا تو ایک بینک سے بہت بڑی رقم قرض بھی لی تھی۔ اور چونکہ بعد میں اس کی فلمیں دھڑا دھڑ ناکام ہونے لگی تھیں، اس لیے وہ بینک سے لیا ہوا قرض واپس نہیں کر سکا تھا۔ اس کی موت کے بعد بینک والوں نے عدالت سے حکم حاصل کیا کہ ضیغم خاں کا محل بیچ دیا جائے، مگر یہاں بھی بینک والوں کو عجب مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ جب محل کے ساز و سامان کی قیمت کا اندازہ کرنے کے لیے بینک کا عملہ وہاں پہنچا تو شام ہو گئی تھی اور محل کے اندر اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔ چاروں طرف ہیبت

ناک سناٹا طاری تھا اور در و دیوار سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ محل کے سامنے والا باغیچہ ایک گھنے جنگل کا منظر پیش کر رہا تھا۔ لمبی لمبی گھاس اور بے شمار پودے اگے ہوئے تھے۔ اس گھاس میں جنگلی چوہے اور اسی طرح کے دوسرے بہت سے جانور دوڑتے پھر رہے تھے۔ کمروں کے اندر گرد و غبار کی موٹی تہہ جم گئی تھی اور جگہ جگہ مکڑیوں نے بڑے بڑے جالے تان دیے تھے۔

بینک والوں نے ابھی دو تین کمروں ہی کے سامان کا جائزہ لیا تھا کہ چھت اور سیڑھیوں پر سے بلّیوں کے چیخنے چلّانے کی آوازیں آئیں پھر کتّے غُرّانے اور بھونکنے لگے۔ اس کے بعد گیدڑوں نے ہُو ہُو کر کے آسمان سر پر اٹھالیا۔ یہ ساری مِلی جُلی آوازیں اس قدر خوف ناک تھیں کہ بینک کے آدمیوں کی سِٹّی گم ہو گئی اور وہ وہاں سے گرتے پڑتے بھاگ نکلے۔ اُن پر ایسا خوف چھایا کہ کسی نے مُڑ کر بھی نہ دیکھا۔ وہ دن اور آج کا دن ضیغم خاں کا محل اسی طرح ویران پڑا ہے۔ بینک والوں نے کئی بار اخباروں میں اشتہار بھی دیا کہ اگر کوئی اس محل کو خریدنا چاہے تو نہایت سستی قیمت پر اسے دے دیا جائے گا، لیکن خریدنا تو ایک طرف،

اس جانب کوئی جانے کا حوصلہ ہی نہیں کرتا تھا۔“

تینوں لڑکے تھوڑی دیر تک ایک دوسرے کی طرف خاموشی سے دیکھتے رہے۔ آخر عنبر نے زبان کھولی اور عاقب سے کہا۔

”تو کیا اُس وقت سے لے کر اب تک کوئی اس محل میں داخل نہیں ہوا؟“

”نہیں، بعض ایسے لوگوں نے محل میں جانے اور وہاں ایک رات گزارنے کی کوشش کی تھی جو بد روحوں اور بھوتوں پر یقین نہیں رکھتے تھے، لیکن کوئی بھی چند گھنٹوں سے زیادہ وہاں نہ رہ سکا۔ جائدادوں کی خرید و فروخت کا دھندا کرنے والے ایک ایجنٹ نے اعلان کیا کہ وہ ضیغم خان کے محل میں ایک رات قیام کرے گا تاکہ خریداروں کو یہ اطمینان دلایا جاسکے کہ اس میں کوئی بھوت پریت نہیں ہے۔ صرف بُزدل لوگوں نے طرح طرح کی کہانیاں گھڑ لی ہیں۔ وہ ایجنٹ محل میں گیا۔۔۔ مگر آدھی رات کے بعد بُری طرح چیختا چلّاتا دہشت سے تھر تھر کانپتا بھاگ نکلا اور محل سے باہر آتے ہی باغیچے میں گِر کر بے ہوش ہو گیا۔ صبح تک وہ بے ہوش پڑا رہا۔ اتّفاق سے اس کا ایک نوکر دو آدمیوں کو لے کر اُدھر آیا

اور اس کو وہاں سے اُٹھا کر ہسپتال لے گیا۔ اس کی بتّیسی بُری طرح جمی ہوئی تھی اور زبان اینٹھ کر رہ گئی تھی۔ ہوش میں آنے کے بعد بھی وہ پاگلوں کی طرح چیختا چلّاتا رہا۔ ڈاکٹروں کو بڑی تگ ودو کرنی پڑی، تب کہیں وہ ٹھیک ہوا۔ بعد میں اس نے قسم کھا کر بتایا کہ ضیغم خاں کے محل پر بہت سی بد روحوں نے قبضہ کر رکھا ہے۔ اس نے بتایا کہ جوں ہی رات کے بارہ بجے محل کے کمروں میں سے ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے بہت سے پُراسرار لوگ دبے پاؤں چل رہے ہوں۔ پھر ہنسنے اور قہقہے لگانے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ آہستہ آہستہ یہ قہقہے ڈراؤنی چیخوں میں تبدیل ہو گئے۔۔۔ ان چیخوں سے محل کی دیواریں اور چھتّیں بھی کانپنے لگیں۔۔۔ ایسا لگتا تھا کہ زلزلہ آرہا ہے۔ اتنے میں سفید سفید دھواں سا پھیلنے لگا۔ اس دھویں میں عجیب بدبو تھی۔۔۔ جیسے جَلے ہوئے گوشت کی ہوتی ہے۔۔۔ یکایک دھوئیں کے اندر سے نیلے رنگ کا ایک چمک دار انسانی سایہ حرکت ہوا نکلا۔۔۔۔"

"خدا کے واسطے چُپ ہو جاؤ۔" نسیم کی خوف سے گھِگھّی بندھ چکی تھی۔ "مجھے ڈر

لگ رہا ہے۔"

"اگر تمہاری یہی حالت رہی تو تم کر چکے سُراغ رسانی۔" عاقِب نے جھنجھلا کر کہا۔ "آخر کس برتے پر میدان میں نکلو گے؟"

"شاباش!" عنبر نے خوش ہو کر کہا۔ "میں خود ان بدروحوں اور بھوتوں وغیرہ پر یقین نہیں رکھتا، لیکن یہ بات ثابت ہے کہ ضیغم خان کے ویران محل میں کچھ نہ کچھ ہے ضرور۔۔۔۔ اچھا یہ بتاؤ کہ وہ محل کب سے خالی پڑا ہے؟"

"میرا خیال ہے، بیس بائیس سال تو ہو ہی گئے ہوں گے۔ یُوں سمجھ لو کہ یہ قصّہ ہماری پیدائش سے بہت پہلے کا ہے۔"

"اور اس وقت سے لے کر اب تک کسی نے اس محل کے اندر جانے کی کوشش نہیں کی؟" عنبر نے پوچھا۔

"بات تو کچھ ایسی ہی ہے، مگر یہ تو بتاؤ کہ تمہارے ارادے کیا ہیں؟" اب عاقِب کی آنکھوں سے بھی خوف جھانک رہا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن آپ ہی آپ

تیز ہو رہی تھی۔

”میں نے ابھی کچھ طے نہیں کیا۔“ عنبر نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ ”ویسے جی چاہتا ہے کہ ہم تینوں ایک بار اس محل کے اندر جا کر دیکھیں تو سہی کہ وہاں ہے کیا۔ ممکن ہے نیلے بھوت سے ملاقات ہو ہی جائے۔“

یہ سنتے ہی نسیم نے جھر جھری لے کر آنکھیں بند کر لیں۔

محل کے اندر

سراغ رساں نمبر ایک کی یہ بات سُننے کے بعد سراغ رساں نمبر دو نمبر تین گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ آخر نسیم نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

”یار، لعنت بھیجو اُس محل پر۔ آخر ہم اس پھڈے میں ٹانگ اُڑائیں ہی کیوں؟ اگر سچ مچ نیلے بھُوت یا ضیغم خاں کی رُوح سے مُلاقات ہو گئی تو کچومر نکل جائے گا۔ نابابا، میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا۔“

”بک بک نہ کرو۔ تمہیں میرے ساتھ چلنا ہو گا۔“ عنبر نے کہا۔ ”ہم اپنے ساتھ

کیمرا اور ٹیپ ریکارڈر لے چلیں گے۔ موقع ملا تو محل کی پُراسرار آوازیں ریکارڈ کریں گے اور نیلے بھُوت سے آمنا سامنا ہو گیا تو اُس کی تصویر بھی کھینچ لیں گے۔"

"سبحان اللہ! سبحان اللہ۔" نسیم نے مُسکرا کر کہا۔ "کیا عقل پائی ہے جناب نے بھی۔ ارے خدا کے بندے، آج تک کسی بے وقوف نے بھوتوں کی آوازیں ریکارڈ کی ہیں یا بد روحوں کی تصویریں بھی اُتاری ہیں؟ مانا کہ تم بہت ذہین اور سمجھ دار ہو، لیکن کبھی کبھی ایسی ہانک جاتے ہو کہ اپنے پلّے کچھ نہیں پڑتا۔ خیر تم جانو اور تمہارا کام۔ میں تو بھُوتوں سے میل ملاپ بڑھانے کا قائل نہیں، اور نہ میں تمہارے ساتھ جاؤں گا۔"

"جائیں گے تو تمہارے فرشتے بھی۔" عنبر نے کہا۔ "ویسے ڈرو نہیں۔ ضیغم خاں کی روح ہمیں کچھ نہ کہے گی۔ آخر ہم کوئی اُس کے دُشمن تھوڑی ہیں۔ اچھا، عاقِب، اب تمہارا کام یہ ہے کہ ویران محل کے بارے میں کچھ اور معلومات حاصل کر کے ہمیں بتاؤ۔ کل سے کار ڈرائیور سمیت ہمارے قبضے میں ہو گی۔ پھر

ہم ایک ماہ تک اسے خوب استعمال کر سکتے ہیں۔"

ابھی اُن کی میٹنگ ختم نہ ہوئی تھی کہ باہر کے دروازے کی گھنٹی زور سے بجی۔ تینوں اُچھل پڑے۔

"ضیغم خیال کی روح آگئی، شاید"نسیم نے کہا۔ عاقب اور عنبر نے قہقہہ لگایا۔ چند لمحے بعد عنبر کی خالہ نے آن کر کہا۔

"عنبر میاں، وہ تمہارا ڈرائیور کار لے کر آگیا ہے۔"

تینوں سراغ رساں جلدی سے باہر نکلے۔ سامنے ایک سیاہ رنگ کی مرسیڈیز کھڑی تھی اور اس کے سامنے ڈرائیور اپنی سفید وردی اور ٹوپی پہنے کھڑا تھا۔

"السلامُ علیکم!"ڈرائیور نے خوش اخلاقی سے انہیں سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔"تینوں نے سلام کا جواب دیا۔

"آپ کا کیا نام ہے؟"عنبر نے پوچھا۔

"میرا نام اللہ داد ہے۔"ڈرائیور نے جواب دیا۔

”اور میں آپ کے ساتھ اگلے ایک ماہ تک اس گاڑی کے ساتھ رہوں گا۔ یہ گاڑی اصل میں کسی ملک کے صدر کے لیے آرڈر دے کر بنوائی گئی تھی، مگر بعد میں انہوں نے کمپنی سے کہا کہ فی الحال یہ گاڑی وہ نہیں لیں گے۔ اس کی جگہ انہیں رولز رائس کار دے دی جائے۔ آپ کو معلوم ہو گا جناب کہ رولز رائس دنیا کی سب سے مہنگی گاڑی ہوتی ہے۔“

”ہاں۔ ہمیں معلوم ہے۔“ عنبر نے کہا۔ ”ویسے یہ مرسیڈیز بھی اپنی شان و شوکت میں کچھ کم نہیں۔ اس کا انجن بھی نہایت طاقت ور ہوتا ہے اور میں نے سنا ہے کہ یہ رُکے بغیر کئی سو میل کا سفر آسانی سے طے کر لیتی ہے۔“

”آپ کی معلومات درست ہیں۔“ اللہ داد نے کہا۔ ”یہ مرسیڈیز کار، جس میں اس وقت آپ بیٹھے ہوئے ہیں۔ بڑی خوبیوں کی مالک ہے۔ اس کے شیشے بلٹ پروف ہیں یعنی ان پر بندوق، پستول یا رائفل کی گولی اثر نہیں کرتی۔ اسی طرح اس کے چاروں ٹائر بھی محفوظ ہیں۔ ان پر بھی بندوق کی گولی اثر نہیں کرے گی۔ اس کے اندر ڈبل انجن لگا ہوا ہے۔ یعنی اگر ایک انجن خراب ہو جائے تو رُکے

بغیر دوسرا انجن چالو کر سکتے ہیں۔ پٹرول کی ٹنکی اتنی بڑی ہے کہ اس میں چھ سو میل تک کے لیے پٹرول بھرا جا سکتا ہے۔ محفوظ پٹرول کے لیے الگ ٹنکی ہے۔ اُس میں بھی تقریباً دس گیلن پٹرول بھرا جا سکتا ہے؟"

"بہت خوب! پھر تو مزا آ گیا۔" عاقب نے کہا۔

"کیا پٹرول پینے کا ارادہ ہے تمہارا جو مزا آ گیا تمھیں؟" نسیم نے چڑ کر کہا۔ اللہ داد یہ سُن کر ہنس پڑا۔

"اس کار میں دو تین خوبیاں اور بھی ہیں، جناب۔" اس نے عنبر سے کہا۔ "آپ کے دوست نے پٹرول پینے کا ذکر کیا، تب مجھے یاد آیا۔" یہ کہہ کر اللہ داد نے ڈیش بورڈ میں لگے ہوئے کئی نیلے پیلے اور لال بٹنوں میں سے ایک بٹن دبایا۔ اسی وقت عنبر کی سیٹ کے بائیں جانب دروازے ہی میں ایک خفیہ خانہ کھل گیا۔ اس میں بجلی کا چھوٹا سا بلب بھی روشن ہو گیا۔

"یہ ننھا سا فرج ہے جناب۔" اللہ داد کی آواز سنائی دی۔ "اس میں آپ ٹھنڈے پانی کی بوتلیں، پھل، شربت آئس کریم اور اس طرح کی کئی چیزیں رکھ سکتے

ہیں۔“

”اللہ داد، زندہ باد!“ نسیم نے خوش ہو کر نعرہ لگایا۔ ”یہ پہلی بات ہے جو تم نے کام کی بتائی۔“

”شکریہ، جناب۔ میں ہر خدمت کے لیے حاضر ہوں؟“ اللہ داد نے جواب دیا۔ ”دوسری خوبی بھی دیکھ لیجیے۔“ اُس نے اس مرتبہ نیلے رنگ کا بٹن دبایا۔ فوراً اگلی سیٹ کی پشت پر ایک خفیہ خانہ کھلا اور اس کے اندر ایک خوب صورت ننھّا منّا ٹیلے فون رکھا نظر آیا۔

”ارے! فون بھی ہے۔“ نسیم اُچھل پڑا۔ ”لیکن یہ تو بتاؤ اللہ داد کہ یہ ٹیلے فون کام بھی کرتا ہے یا محض دل بہلانے کے لیے رکھا گیا ہے۔“

”معلوم ہوتا ہے بھس بھرا ہے تمہاری کھوپڑی میں۔ کبھی تو عقل سے کام لے لیا کرو۔“ عنبر نے کہا۔ ”اتنی شان دار گاڑی میں کیا یہ ٹیلے فون دکھاوے کے لیے لگایا گیا ہو گا؟ اللہ داد، تم بتاؤ، اِسے استعمال کرنے کا طریقہ کیا ہے؟“

”طریقہ بہت آسان ہے جناب۔ دیکھیے، اس کے اوپر پیلے رنگ کا ایک ننھا سا بٹن لگا ہے۔ بس رسیور سے دبا دیجیے۔ اسی وقت ٹیلے فون ایکس چینج میں گھنٹی بجے گی اور آپریٹر فوراً آپ سے کہے گا، نمبر پلیز۔ آپ جس نمبر سے بات کرنا چاہتے ہوں وہ نمبر آپریٹر کو بتا دیجیے۔ تین سیکنڈ کے اندر اندر وہ نمبر ملا کر آپ سے کہے گا، بات کیجیے جناب۔ ویسے ہنگامی حالت میں آپ آپریٹر کی مدد کے بغیر براہِ راست بھی گفتگو کر سکتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے آپ کو لال رنگ کا بٹن دبا کر نمبر ڈائل کرنا پڑے گا۔“

عنبر نے اسی وقت زرد رنگ کا بٹن دبایا، بٹن دباتے ہی آپریٹر کی آواز کان میں آئی۔ ”نمبر پلیز۔“ عنبر نے اسے گھر کا فون نمبر بتایا۔ پھر گھنٹی کی آواز آئی اور دوسرے ہی لمحے عنبر کی خالہ فون پر بول رہی تھیں۔

”کون صاحب ہیں؟ کس سے بات کریں گے؟“

”خالہ جان، میں عنبر بول رہا ہوں۔ میں اس وقت اس مرسیڈیز گاڑی میں سفر کر رہا ہوں جو میں نے ذہنی آزمائش کے انعامی مقابلے میں ایک ماہ کے لیے انعام

میں حاصل کی ہے۔ اس گاڑی میں ٹیلی فون بھی لگا ہوا ہے۔ میرے ساتھ نسیم اور عاقب بھی ہیں۔ اگر ہمیں دیر ہو جائے تو آپ تھانے میں ہماری گمشدگی کی اطلاع دینے نہ پہنچ جایئے گا۔ انشاء اللہ ہم بخیر و عافیت واپس گھر آ جائیں گے۔"

"مگر تم لوگ جا کہاں رہے ہو؟" خالہ نے پریشان ہو کر کہا۔ "دیکھو کوئی ایسا کام نہ کر بیٹھنا جس میں خواہ مخواہ مصیبت اُٹھانی پڑے۔"

"نہیں خالہ جان، گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔" عنبر نے ہنس کر انہیں اطمینان دلایا۔ "ہم لوگ صرف بھُوت محل تک جا رہے ہیں۔"

"خالہ جان، آپ نے ضیغم خان کا نام سنا ہو گا۔ وہ اپنے زمانے کا مشہور فلمی اداکار تھا۔"

"وہی نا جو ڈراؤنی فلموں میں آتا تھا؟" خالہ نے بات کاٹ کر کہا۔ "اور بعد میں سنا گیا کہ اس نے اپنی کار سمندر میں گرا کر خودکشی کر لی تھی؟"

"جی ہاں، جی ہاں وہی۔ ضیغم خاں۔ آج کل اس کا محل ویران پڑا ہے اور ہم نے

سنا ہے کہ اس پر اس کی روح کا قبضہ ہے۔ وہاں برسوں سے کسی کو جانے کی جرأت نہیں ہوئی۔ اب ہم دیکھنے جا رہے ہیں کہ کیا واقعی وہاں ضیغم خان کی روح رہتی ہے۔۔۔۔"

"اے میرے اللہ۔" خالہ نے چلّا کر کہا۔ "ارے بیٹا! فوراً واپس آ جاؤ۔ اس چکر میں نہ پڑو۔ یہ تمہارے بس کی بات نہیں ہے؟ فوراً چلے آؤ۔ خبر دار! ہرگز وہاں قدم نہ رکھنا۔ اگر ایک دفعہ ضیغم خان کا بھوت تمہیں لپٹ گیا تو پیچھا چھڑانا مشکل ہو جائے گا۔۔۔"

عنبر نے قہقہہ لگا کر فون بند کر دیا۔

"لاحول ولا قوۃ۔ خواہ مخواہ میں نے خالہ جان سے ذکر کر دیا۔" اس نے عاقب اور نسیم سے کہا۔ "اب وہ یہی سوچ سوچ کر خوف سے کانپتی رہیں گی کہ کہیں ضیغم خان کی روح انہیں گرفتار نہ کر لے۔ توبہ توبہ! یہ پرانے زمانے کے لوگ بھی بھوتوں اور روحوں سے کیسے ڈرتے ہیں۔ حال آں کہ ان چیزوں کا کوئی وجود سرے سے ہوتا ہی نہیں۔"

”یہ تو آپ نے بالکل ٹھیک کہا جناب“ اللہ داد بُول اٹھا۔ ”ہم بھی بچپن سے ان بھوتوں کے قصّے سنتے آ رہے ہیں لیکن آج تک کسی بھوت سے ہماری ملاقات ہوئی نہیں۔ ویسے مجھے بڑا ارمان ہے بھوت کو دیکھنے کا۔“

”اللہ تمہاری آرزو پوری کرے۔“ نسیم نے ایسے لہجے میں کہا کہ سب بے اختیار ہنس پڑے۔ عنبر کہنے لگا:

”اللہ داد، مہربانی کر کے تم ہمیں جناب جناب مت کہو۔ ہمیں کچھ اچھا نہیں لگتا کہ ہم سے دُگنی عمر کا آدمی ہمیں جناب جناب کہہ کر پکارے، ہم تم سے بہت چھوٹے ہیں، اس لیے ہمیں ناموں سے پکارو تو ہم خوش ہوں گئے۔“

”خدا آپ کو سلامت رکھے میاں۔“ اللہ داد نے شفقت سے جواب دیا۔ ”کاش! ہماری قوم میں سب بچے آپ ہی جیسے تمیز دار اور ذہین ہوں۔ اچھّا، اب کہیے کدھر چلوں؟“

”لیجیے، تمام رات یوسف زلیخا کی کہانی سُنتے رہے اور صبح کو پوچھتے ہیں کہ زلیخا مرد تھا یا عورت۔“ نسیم نے ہنس کر کہا۔ ”ارے صاحب، وہی بھوت محل کی طرف

چلو، پہلے تو واقعی مجھے بھی عاقب کی زبانی یہ قصّہ سن کر ڈر لگا تھا، مگر اب میں بھی بھوت صاحب کی زیارت کرنا چاہتا ہوں۔"

"اس بھوت صاحب کا بھی جواب نہیں۔" عنبر نے نسیم کی پیٹھ پر ہاتھ مار کر کہا۔

اللہ داد نے گاڑی پوری رفتار سے تار کول کی سیاہ چمک دار سڑک پر ڈال دی۔ وہ سیدھے شاداب نگر سے جنوب کی طرف جا رہے تھے جہاں سمندر کے نزدیک خشک ریتلی پہاڑیوں کے درمیان ضیغم خاں کا محل کھڑا تھا۔ اس وقت شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے اور سورج تیزی سے مغرب میں اتر رہا تھا۔

کار اب ویران اور پہاڑی راستے پہ دوڑ رہی تھی۔ چٹّانوں کی طرف اوپر ہی اوپر بل کھاتی ہوئی سڑک نہ جانے کہاں ختم ہوتی ہو گی۔ عنبر، نسیم اور عاقب تینوں خاموش تھے اور کھڑکیوں سے آنکھیں لگائے باہر کی ویرانی کا منظر دیکھ رہے تھے۔ اللہ داد بہت تجربے کار اور حاضر دماغ ڈرائیور تھا۔ چٹانوں کے دائیں بائیں، سڑک کے بالکل ساتھ ساتھ کئی کئی سو فٹ گہرے کھڈ اور کھائیاں تھیں۔ اگر ڈرائیور کا ہاتھ ذرا بھی کسی موڑ پر بہک جائے تو کار اِن گہرے کھنڈوں میں جا

گرے، نہ معلوم ان ویران چٹانوں کے اندر کتنے خوف ناک حادثے ہوئے ہوں گے اور کتنی جانیں ڈرائیوروں کی بے پروائی کے باعث ضائع ہوئی ہوں گی۔

اللہ داد نے اب کار کی بتّیاں روشن کر دی تھیں۔ ان کی روشنی چٹانوں پر پڑتی تو وہاں اَن گنت ننھی ننھی آنکھیں سی چمکتی دکھائی دیتیں۔ عنبر نے اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ یہ ان کیڑے مکوڑوں کی آنکھیں ہیں جو لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں اندھیرا ہوتے ہی چٹانوں پر نمودار ہو جاتے ہیں۔ ان کی خوراک وہ گھاس پھوس ہے جو اِن چٹانوں کے اوپر اُگتا ہے۔

اللہ داد نے شکار کی رفتار خاصی ہلکی کر دی تھی کیوں کہ سڑک نہایت تنگ ہوتی جا رہی تھی اور ہر دس فٹ کے فاصلے پر کوئی نہ کوئی موڑ آتا تھا۔ یکایک عنبر نے اپنی قمیص کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک نقشہ نکالا اور دونوں گھٹنوں پر پھیلا لیا۔ پھر انہوں نے کار کی چھت میں لگا ہوا چھوٹا سا بلب روشن کیا۔ اس کی روشنی اتنی تھی کہ وہ نقشہ آسانی سے دیکھ سکتے تھے۔

”میرا خیال ہے، ضیغم خاں کا محل اب زیادہ دور نہیں۔“ عنبر نے کہا۔ ”اتفاق کی

بات ہے کہ اس علاقے کا نقشہ میں نے پہلے ہی جیب میں رکھ لیا تھا۔ میرا خیال ہے عاقِب، اللہ داد کے ساتھ کار ہی میں بیٹھ کر ہمارا انتظار کرے اور دونوں محل کے اندر جائیں۔"

"بالکل ٹھیک۔" عاقِب نے جلدی سے کہا۔ "پہلے تم دونوں وہاں گھوم پھر آؤ، موقع ملا تو میں بھی کسی دن محل میں چلا جاؤں گا۔"

"یوں کیوں نہیں کہتے کہ اس وقت محل میں جاتے ہوئے تمہیں ڈر لگ رہا ہے؟" نسیم نے کہا۔

ایک موڑ کاٹتے ہوئے اللہ داد نے فوراً بریک لگائے۔ ٹائروں سے چیخ کی آواز نکلی اور کار ایک ہلکے سے دھچکے کے ساتھ رُک گئی۔

"کیا بات ہے اللہ داد؟ خیر تو ہے؟" عنبر نے پوچھا۔

"میاں، ذرا سامنے دیکھیے۔" اللہ داد نے جواب دیا۔ تینوں لڑکوں نے گردنیں اٹھا اٹھا کر سامنے سڑک پر نگاہ ڈالی۔ کار کی تیز روشنی میں انہیں ایک بہت بڑا پتھر

دکھائی دیا جو شاید کسی اُونچی چٹان سے ِگرا ہو گا اب اس نے آدھی سڑک روک دی تھی۔ یہ پتھر کئی من وزنی تھا۔

"کار آگے نہیں جاسکے گی۔ میاں۔" اللہ داد نے کار ایک طرف روکی اور انجن بند کرتے ہوئے کہا۔ پھر بڑی بتّیاں بجھا کر چھوٹی اگلی بتّیاں روشن کر دیں۔

"یار یہ تو بہت بُرا ہوا۔" نسیم نے کہا۔ "اَب خدا جانے وہ بے ہودہ محل یہاں سے کتنی دور ہو گا۔ میرا خیال ہے ٹھنڈے ٹھنڈے گھر واپس چلو۔ کل آجائیں گے۔"

"ٹھیک ہے تم یہاں سے پیدل گھر واپس جاسکتے ہو۔" عنبر نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں تو محل دیکھے بغیر واپس نہ جاؤں گا۔ آؤ عاقب، تم میرے ساتھ چلو۔ ہمیں زیادہ دُور نہ جانا پڑے گا۔ زیادہ سے زیادہ محل دو تین فرلانگ دور ہو گا۔ ان چٹانوں کی وجہ سے اس کی بُرجیاں دکھائی نہیں دے رہی ہیں۔"

یہ کہہ کر عنبر نے کار کا دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا اُس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی ٹارچ تھی۔ اس نے نسیم اور عاقِب کی حیرت دور کرتے ہوئے کہا۔

"یہ ٹارچ میں نے اسی کار میں سے بر آمد کی ہے۔ جس خانے میں ٹیلے فون رکھا ہے، یہ بھی وہیں رکھی تھی، اچھا اللہ داد، تم ہماری واپسی تک یہیں ٹھہروگے۔ ہاں جی، اب بولو، تم دونوں میں سے کون میرے ساتھ چلے گا؟"

"چلو، میں چلتا ہوں۔" نسیم نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ عاقب اور عنبر نے زور کا قہقہہ لگایا۔

اللہ داد کہنے لگا۔ "میاں، میرا جی بھی آپ کے ساتھ جانے کو چاہتا ہے۔ لیکن کمپنی کے مالکوں کی ہدایت ہے کہ میں ایک لمحے کے لیے بھی کار کو اپنی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دوں۔"

"نہیں، اللہ داد۔ تمہارا یہیں رہنا مناسب ہے۔ بس ہم ابھی آئے۔ آؤ، نسیم۔"

وہ دونوں ٹارچ کی روشنی میں تیزی سے سڑک پر چلنے لگے۔ اس گہرے سنّاٹے میں ان کے جوتوں کی آواز گونج رہی تھی۔ جُوں جُوں وہ دور ہٹتے گئے، عاقِب کا دِل آپ ہی آپ بیٹھتا گیا۔ اس نے دِل میں دُعا کی کہ وہ دونوں بخیر و عافیت واپس آ جائیں۔ رات کی تاریکی میں ایسی خطرناک جگہوں پر جانا ویسے بھی ٹھیک نہیں

ہوتا۔

عنبر اور نسیم اب چلنے کے بجائے دوڑ رہے تھے۔ کوئی ایک فرلانگ جانے کے بعد انہوں نے عین سامنے، کچھ فاصلے پر بھُوت محل کی اونچی بُرجیاں دیکھیں جو اندھیرے میں خوف ناک کالے دیووں کی طرح سر اُٹھاتے کھڑی تھیں دونوں رُک کر غور سے ان بُرجیوں کی طرف تکنے لگے۔

"میں تو واپس جاتا ہوں۔" نسیم نے کہا۔ "قسم لے لو وہاں ضرور بھوتوں کا ڈیرا ہو گا۔"

"بکواس مت کرو۔ آگے بڑھو۔" عنبر نے اُسے آگے دھکا دیا۔

جوں جوں وہ قریب ہوتے گئے، بھُوت محل کے در و دیوار واضح ہوتے چلے گئے۔ چاروں طرف ہیبت ناک سنّاٹا طاری تھا۔ ایسا سنّاٹا کہ دونوں لڑکے اپنے دل کے دھڑکنے کی آواز بھی سُن سکتے تھے۔

"ایسا لگتا ہے کہ ہم چاند کی سرزمین پر چل پھر رہے ہیں۔ ویسی ہی چٹانیں ہیں،

ویسے ہی غار اور ویسی ہی پتھریلی زمین، کوئی آدم نہ آدم زاد۔"

ضیغم خان نے محل بنانے کے لیے جگہ اچھی چنی۔" عنبر نے کہا۔ "مزا آگیا ہماری پہلی ہی مہم اس قدر شان دار ثابت ہو رہی ہے۔"

"لعنت ہے اس مہم پر۔" نسیم نے کہا۔ "ڈر کے مارے میری جان نکلی جا رہی ہے۔ اور تمھیں مزا آرہا ہے۔"

کچھ اور فاصلہ طے کر کے دونوں آخر کار آسیبی محل کے عین سامنے پہنچ گئے۔ بڑے دروازے کے آگے خاصا وسیع باغ تھا۔ یہاں زمین کچھ ہموار تھی۔ وہاں بے شمار خود رو جھاڑیاں، لمبی گھاس اور پودے اُگے ہوئے تھے۔ اس باغ کے بیچ میں ایک چھوٹی سی پگ ڈنڈی تھی جو بل کھاتی ہوئی محراب نما اونچے سے دروازے تک جاتی تھی۔

"خدا کی پناہ! کیسا ڈراؤنا منظر ہے۔" نسیم نے کہا۔ "میری مانو تو اب بھی لوٹ چلو۔ دن کی روشنی میں یہاں آئیں گے اور مزے سے گھومیں پھریں گے۔"

"دن کے وقت آنا بے کار ہے۔" عنبر نے جواب دیا۔ "بھوت پریت دن میں نہیں نکلا کرتے۔ ان سے ملاقات کا بہترین وقت رات ہی کا ہوتا ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ جلدی میں ہم کیمرا اور ٹیپ ریکارڈر لانا بھول گئے۔"

"اتنے میں یوں لگا جیسے کوئی دبے پاؤں ان کی طرف آ رہا ہے۔ اندھیرے میں کسی کے قدموں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔"

"کوئی آ رہا ہے؟" نسیم نے چُپکے سے کہا۔

"ہاں۔" عنبر نے جواب دیا۔ پھر اس نے لپک کر نسیم کا ہاتھ پکڑا اور دونوں ایک چٹان کے پیچھے دُبک گئے۔ ٹارچ انہوں نے اسی وقت بجھا دی تھی۔ یکایک آنے والا رُکا۔ پھر اس نے ایک چیخ ماری اور چٹانوں میں دوڑتا ہوا غائب ہو گیا۔ ڈر کے مارے نسیم کی گھِگھی بندھ گئی۔

"ک۔۔۔ ک۔۔ کون۔۔۔ کون تھا یہ؟" اس نے ہکلا کر کہا۔ "کوئی بھوت ہی ہو گا۔۔۔"

”جی نہیں۔ یہ ایک چھوٹا سا گیدڑ تھا۔“ عنبر نے ٹارچ روشن کرتے ہوئے اسے تسلّی دی۔

”خدا غارت کرے۔“ نسیم نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

عنبر نے ہنس کر پوچھا۔ ”خدا اسے غارت کرے؟ مجھے یا گیدڑ کو؟“

”دونوں کو۔“ نسیم نے منہ بنا کر کہا۔ ”اب آگے بڑھو گے یا ساری رات میں گزار دینے کا ارادہ ہے؟“

چند لمحوں بعد وہ دونوں پگ ڈنڈی پر چلتے ہوئے دروازے کے پاس پہنچ گئے۔ محل کی دیواریں کالی ہو رہی تھیں اور ان میں نمی کے اثرات تھے، عنبر نے دیوار کو انگلی سے چھو کر دیکھا۔ شاید اس پر کائی جمی ہوئی تھی۔ سارا محل پتھر سے بنایا گیا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ تمام کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں اور دروازہ بھی چوپٹ کھلا پڑا تھا۔

اچانک کوئی بڑا سا کالے رنگ کا پرندہ ان کے سروں پر سے پھڑ پھڑاتا ہوا گزر

گیا۔ نسیم کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ عنبر نے کہا۔ ''گھبراؤ نہیں، چمگادڑ تھی۔ اس کی غذا صرف کیڑے مکوڑے ہیں۔ یہ آدمیوں کو نہیں کھاتی۔''

''ممکن ہے۔'' آسیبی محل کی چمگادڑیں آدمیوں کو ہڑپ کرنے کی عادی ہوں۔'' نسیم نے جواب دیا۔

''آؤ، اب اندر چلیں۔'' عنبر نے نسیم کا ہاتھ پکڑا۔

''یار، میرا تو پاؤں نہیں اُٹھتا۔ ٹانگیں حرکت کرنے سے انکار کر رہی ہیں۔ میں یہیں بیٹھتا ہوں۔ تم اندر گھوم پھر آؤ۔''

''چلو، چلو۔ زیادہ نخرے نہ کرو۔'' عنبر نے اسے ڈانٹا ابھی انھوں نے دروازے میں قدم دھرا ہی تھا کہ محل کے اندر سے نہایت دھیمی آواز میں پیانو بجتا سنائی دیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

''کیا میرے کان بج رہے ہیں؟'' نسیم نے کہا۔

''کان نہیں، پیانو بج رہا ہے۔'' عنبر نے اطمینان سے کہا۔ ''معلوم ہوتا ہے ضیغم

خان کو پیانو سے بہت دل چسپی تھی۔ آؤ، دیکھیں۔"

"افوہ! غضب کرتے ہو۔ بھاگو یہاں سے۔"

"نہیں۔ اب تو دیکھے بغیر نہ جائیں گے۔" عنبر نے سختی سے نسیم کا ہاتھ پکڑ لیا۔

ہال کمرے میں گھُپ اندھیرا تھا۔ اتنا اندھیرا کہ ان کی ننھی سی ٹارچ بھی اسے دور کرنے میں ناکام ہو رہی تھی۔ فرش پر گرد کی موٹی تہہ جمی ہوئی تھی۔ کونوں اور گوشوں میں مکڑیوں نے بڑے بڑے جالے تن رکھے تھے اور فضا میں عجیب سی بدبُو پھیلی ہوئی تھی، ایسی بدبُو جو پرانے قبرستانوں یا بوسیدہ قبروں کے اندر سے آیا کرتی ہے۔ ٹارچ کی روشنی ہال کمرے میں رکھی ہوئی مختلف چیزوں پر پڑتی تو ان کے مدّھم سائے حرکت کرتے دکھائی دیتے۔

پیانو بجنے کی وہ پراسرار دھیمی آواز اب ختم ہو چکی تھی۔ عنبر اور نسیم نے سوچا شاید یہ اُن کا وہم تھا، ورنہ اِس ویران محل میں بھلا اس وقت کون پیانو بجا رہا ہو گا۔

بال کمرے کے درمیان میں پہنچ کر وہ دونوں رُکے اور گردن گھُما گھُما کر آس پاس کی چیزوں کا جائزہ لینے لگے۔ نسیم نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا:

"بھئی مجھے تو سردی سی لگ رہی ہے۔ اب یہاں سے بھاگنا چاہیے۔"

"بھاگنا چاہیے۔۔۔۔" کسی پر اسرار آواز نے چُپکے سے اُن کے کانوں میں کہا۔ "بھاگنا چاہیے۔۔۔ بھاگنا چاہیے۔"

بھُوت کی آواز

"تم نے یہ آواز سنی؟" نسیم نے گھبرا کر عنبر سے پوچھا۔ "ابھی ابھی کسی نے میرے کان میں چُپکے سے کہا ہے۔ بھاگنا چاہیے۔۔۔" یہ کہ کر نسیم نے دروازے کا رُخ کیا۔

"ٹھہرو۔۔۔!" عنبر نے اس کی آستین پکڑلی۔

"ٹھہرو۔۔۔ ٹھہرو۔۔۔! ٹھہرو۔۔۔" کمرے میں وہی پراسرار آواز تین مرتبہ گونجی۔

"بھوت کی آواز۔" نسیم نے کانپ کر کہا۔ "عنبر، زیادہ بہادری مت دکھاؤ۔۔۔ اب بھی بھاگ نکلو۔۔۔"

"تم تو واقعی بڑے بزدل ثابت ہوئے۔" عنبر نے ہنس کر کہا۔ "بھوت وُوت کی آواز بھلا کہاں سے آئی۔ ذرا غور کرو گے تو سب معاملہ تمھاری سمجھ میں آجائے گا۔ جسے تم بھوت کی آواز سمجھ رہے ہو، وہ تمھاری اپنی آواز ہے۔"

"میری اپنی آواز۔" نسیم کے لہجے میں حیرت تھی۔ "ہاں، یہ ہال کمرا خاصا اونچا ہے، اور ہم اس کے بیچوں بیچ کھڑے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم کچھ کہتے ہیں تو ہال کی دیواروں اور چھتوں سے ٹکرا کر ہماری آواز کی لہریں واپس آتی ہیں اور یوں ہمیں بھوت کی آواز سنائی دیتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے ضیغم خان نے یہ ہال خاص طور پر اس لیے بنایا ہے کہ اس کے مہمان جب یہاں بات چیت کریں تو انھیں اپنی آوازوں پر بھوت کی آوازوں کا شُبہ ہو۔ بے شک، تم تجربہ کر کے دیکھ لو۔"

نسیم نے اونچی آواز میں کہا۔ "بھُوت۔۔۔بھُوت۔۔۔بھُوت۔۔۔"

اُسی وقت اس کے کانوں میں کسی نے چُپکے سے کہا: ”بھُوت۔۔۔ بھُوت۔۔۔ بھُوت۔۔۔“

”واقعی تم ٹھیک کہتے ہو۔“ اب نسیم کی جان میں جان آئی۔ ”یہ تو میری ہی آواز تھی۔ اب میں ایک زور دار قہقہہ لگاتا ہوں۔ دیکھوں، جواب میں کیا سنائی دیتا ہے۔“

”ہاہاہا۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔“ اس نے پھیپھڑوں کی پُوری قوّت سے قہقہہ لگایا۔ جواب میں بھُوت کے قہقہہ لگانے کی آواز سنائی دی ہاہاہا۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔“ آہستہ آہستہ بھُوت کے قہقہے کی آواز دُور ہٹتے ہٹتے بالکل ختم ہو گئی۔

وہ دونوں ہال کمرے کی دوسری جانب گئے۔ وہاں بھی ایک دروازہ تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں آگے بڑھتے ہوئے وہ اس دروازے سے نکلے۔ اب انہوں نے خود کو ایک چھوٹے سے کمرے میں پایا۔ وہیں ایک زینہ بھی تھا جو شاید دوسری منزل کو جاتا تھا۔ اس کمرے میں بے شمار پرانی چیزیں سجی ہوئی تھیں۔ قدیم زمانے کے ہتھیار اور تصویریں کثرت سے تھیں۔ ان سب پر مٹّی کی منوں تہہ جمی ہوئی تھی

اور یوں لگتا تھا جیسے صدیوں سے یہاں کوئی نہیں آیا۔

تمام تصویریں لکڑی کے عمدہ اور قیمتی فریموں میں لگائی گئی تھیں۔ ان کی شکلیں ڈراؤنی اور عجیب تھیں۔ کوئی شخص خوف ناک کبڑا تھا، تو کوئی خون پینے والی بلا کے روپ میں دانت نکالے کھڑا تھا۔ عنبر نے نسیم کو بتایا کہ غور سے اِن سب تصویروں کو دیکھو۔ یہ ایک ہی شخص کے مختلف چہرے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے یہ اس محل کے مالک ضیغم خان کی تصویریں ہیں۔ اس کی مشہور فلموں کے تمام کردار ان تصویروں میں نظر آتے ہیں۔ یہ اس زمانے کے کردار ہیں جب فلمیں گونگی ہوا کرتی تھیں۔ ان میں آواز نہیں ہوتی تھی اور سینما کے پردے پر صرف تصویریں ہی حرکت کرتی نظر آتی تھیں۔"

وہ باری باری ہر تصویر پر تاریخ کی روشنی ڈال کر غور سے دیکھتے رہے۔ خاصی ڈراؤنی اور ہیبت ناک شکلیں تھیں۔ انھی میں ایک تصویر کسی بحری قزّاق کی تھی۔ ایک آنکھ والا قزّاق۔ اسے دیکھ کر نسیم کے بدن میں تھرتھری سی چھُوٹ گئی اور ٹارچ اس کے ہاتھ سے چھُٹ کر فرش پر جاگری۔

”ع۔۔۔ع۔۔۔ عنبر۔“ اس نے خوف سے بے حال ہو کر آواز دی۔ عنبر نے جھپٹ کر ٹارچ اٹھائی اور پوچھا۔ ”کیا بات ہے۔ نسیم! ڈر کیوں رہے ہو؟“

”د۔۔۔ دیکھو۔۔۔ اس قزّاق کی طرف دیکھو۔۔۔ خدا کی قسم، میں نے اسے ابھی پلک جھپکتے دیکھا ہے۔ پہلے تو وہ اپنی ایک آنکھ سے مجھے گھورتا رہا۔ پھر کئی مرتبہ پلک جھپکی۔“

عنبر نے قزّاق کی تصویر پر روشنی ڈالی۔ وہ پتھّر کی طرح بے جان تھی۔ اس کی بائیں آنکھ پر کالے کپڑے کی پٹی بندھی دکھائی گئی تھی اور دائیں آنکھ کھلی ہوئی تھی۔ اس آنکھ میں خون کی سی سُرخی جھلک رہی تھی۔ اس تصویر میں نہ جانے ایسی کیا بات تھی کہ عنبر جیسا جی دار لڑکا بھی ایک لمحے کے لیے خوف زدہ ہو گیا، لیکن پھر فوراً سنبھل کر قہقہہ لگایا اور کہا۔ ”ارے بھائی، اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے؟ ایک بے جان تصویر ہے۔ اب رہا اس کے پلک جھپکنے کا ماجرا، تو میرا خیال ہے تمھیں وہم ہوا ہو گا۔ لکڑی کے فریموں میں سجی ہوئی بے جان تصویریں پلک نہیں جھپکایا کرتیں؟“

"م۔۔۔ م۔۔۔ مگر میں نے خود اپنی آنکھوں سے اسے کئی بار پلک جھپکاتے دیکھا۔۔۔ یقین کرو۔۔۔" نسیم نے بڑے یقین سے کہا۔ "میں دھوکا نہیں کھا سکتا۔ وہ بالکل اصلی آنکھ تھی۔"

"میں پھر کہتا ہوں تمھیں وہم ہوا ہو گا۔" عنبر نے جواب دیا "لیکن بحث میں پڑے بغیر آؤ ہم اسے قریب سے دیکھے لیتے ہیں۔"

دونوں تصویر کے بالکل قریب جا کھڑے ہوئے اور ٹارچ کی روشنی اس کی آنکھ پر ڈالی۔ اب نسیم نے دیکھا کہ عنبر سچ کہتا ہے۔ وہ آنکھ رنگ اور برش ہی سے بنی ہوئی تھی، لیکن مصوّر نے اسے اتنی مہارت سے بنایا تھا کہ بالکل اصلی آنکھ کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ نسیم نے مطمئن ہو کر کہا:

"ممکن ہے یہ میرا وہم ہی ہو مگر دیکھنا، کیا تمہیں بھی سردی لگ رہی ہے، یا یہ بھی میرا وہم ہی ہے؟"

عنبر کو اُس کے دانت بجنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ خود عنبر نے بھی سردی کی ایک لہر اپنی ریڑھ کی ہڈی میں اترتی ہوئی محسوس کی۔

"بے شک، یہ گھر ٹھنڈا ہے۔" عنبر نے اقرار کیا۔ "سُنا ہے جن مکانوں میں بد روحیں یا آسیب وغیرہ ہوتا ہے وہ برف کی طرح ٹھنڈے رہتے ہیں۔"

"تب تو پھر طے ہے کہ یہاں بھی بد روحوں کا قبضہ ہے۔" نسیم نے جلدی سے کہا۔ "اس کے دانت اب بھی بج رہے تھے۔

یکایک انہوں نے دیکھا کہ کمرے میں ایک عجیب سا سرمئی رنگ کا دھواں پھیلنے لگا ہے۔ جب اس دھوئیں پر ٹارچ کی روشنی پڑتی تو اس میں گرد و غبار کے ذرّے ناچتے ہوئے نظر آتے۔ اب پہلی بار عنبر کے دل پر بھی دہشت طاری ہوئی۔ اس نے سختی سے اپنے ساتھی کا بازو پکڑ لیا۔ دھواں تیزی سے پھیل رہا تھا اور اس کے اندر سے جلے ہوئے گوشت کی سی بُو آ رہی تھی۔ یکایک ان دونوں نے بھاگنے کا فیصلہ کیا اور دوڑتے ہوئے دوبارہ ہال کمرے ہیں آ گئے۔ وہاں سے تیر کی طرح نکلے اور پھر پگڈنڈی سے ہوتے ہوئے سڑک پر آ گئے۔ اس دوران میں ٹارچ ہاتھ سے چھوٹ کر نہ جانے کہاں گِر گئی تھی۔ وہ اندھا دھند دوڑ رہے تھے۔ نسیم نے بھاگتے بھاگے اُکھڑی ہوئی آواز میں کہا:

”کوئی ہمارا پیچھا کر رہا ہے۔۔۔۔ کوئی۔۔۔“

”نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ یہ بھی ہمارے قدموں کی آواز ہے۔ جو ہمیں دھوکا دے رہی ہے۔۔۔“ عنبر نے بھاگتے بھاگتے جواب دیا۔

جب وہ سڑک پر پہنچ گئے تب پر اسرار قدموں کی آوازیں ایک دم بند ہو گئیں۔ ثابت ہو گیا کہ وہ بھی انہی کے قدموں کی آوازیں تھیں۔ اب وہ چٹانوں کے درمیان میں سے گزر رہے تھے۔ ہر طرف تاریخی تھی اور ہوا سائیں سائیں کرتی ہوئی چل رہی تھی۔ انہیں یُوں لگ رہا تھا جیسے وہ ایک اَن دیکھی، اَن جانی دنیا میں سفر کر خاصی دُور جا کر انہوں نے دم لیا اور پلٹ کر دیکھا۔ ضیغم خاں کا پُر اسرار آسیبی محل ایک دُھندلی عمارت کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ دور۔۔۔ بُہت دُور مغرب میں نگار آباد کی روشنیاں چمک رہی تھیں۔ ان روشنیوں کو دیکھ کر اُن دونوں کی جان میں جان آئی۔ وہ تھوڑی دیر ایک چٹان کی اوٹ میں کھڑے اپنا پھولا ہوا سانس ٹھیک کرتے رہے۔ نسیم کی حالت بہت خراب تھی۔ وہ اب بھی چونک چونک کر اپنے دائیں بائیں یوں دیکھتا، جیسے ابھی ابھی اس سامنے والی چٹان

کے پیچھے سے ضیغم خان کا بھوت نکلے گا اور اسے دبوچ کر محل کی طرف بھاگ جائے گا۔

"اگر اب مجھے کوئی ایک لاکھ روپیہ بھی دے تب بھی اس منحوس جگہ نہ جاؤں گا۔" نسیم نے اعلان کیا۔ "تم مانو یا نہ مانو، وہاں کچھ نہ کچھ ہے ضرور۔"

"بھئی سچ پوچھو تو میری دلچسپی پہلے سے بھی زیادہ ہو گئی ہے۔" عنبر نے نگار آباد کی روشنیاں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "جو کچھ ہم نے دیکھا یا محسوس کیا وہ سب شعبدے بازی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اگر ہم کھوج میں لگے رہیں تو ایک نہ ایک دن حقیقت کھل ہی گئی جائے گی۔" "حقیقت کھُلے یا نہ ہو، میں اس معاملے میں تمھارا ساتھ نہیں دے سکتا۔" نسیم نے کہا۔ "بابا، سب کو اپنی جان پیاری ہے۔ تم بے شک بھُوتوں سے اُلجھتے رہو۔ میں نے توبہ کی آئندہ اِدھر آؤں تو جو چور کی سزا وہ میری۔"

"خیر، دیکھا جائے گا۔" عنبر نے ہنس کر کہا۔ "یہ بات تو تم نے پہلے بھی کہی تھی۔"

وہ دونوں پھر وہاں سے چلے۔ اب وہ تیزی سے ڈھلواں سڑک پر اُترتے جا رہے تھے۔ اللہ دار نے اُن کے جانے کے بعد کار کی بتّیاں جلا دی تھیں تا کہ اِن لوگوں کو کار کی تلاش میں پریشانی کا سامنا نہ ہو۔

ابھی وہ کار کی طرف بڑھ ہی رہے تھے کہ محل کی جانب سے ہولناک چیخیں بلند ہونے لگیں۔ ایسی چیخیں جیسے ہزاروں گیدڑ اور لکڑ بگے چلّا رہے ہوں۔ بڑے بڑے دِل گُردے والے ان چیخوں کو سُنتے تو خون رگوں میں جم جاتا۔ ایک لمحے کے لیے عنبر پر بھی خوف طاری ہوا، لیکن اُس نے حوصلہ کیا اور محل کی طرف سے آنے والی ان چیخوں کو غور سے سننے لگا۔ اسے خبر بھی نہ ہوئی کہ نسیم کب بھاگ کر کار میں جا بیٹھا تھا۔

ایک دو منٹ بعد چیخیں آپ ہی آپ مدّھم پڑتے پڑتے رُک گئیں۔ عنبر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا کار کے پاس آیا۔ اللہ داد نے جھٹ دروازہ کھول دیا۔ کار کے اندر کی بتّی جل اُٹھی۔ اس کی زرد روشنی میں عنبر کو نسیم اور عاقب کے چہرے دکھائی دیے جو دہشت سے سفید پڑ چکے تھے۔

”میاں، یہ چیخوں کی آواز کیسی تھی؟“ اللہ داد نے پوچھا۔ ”بھئی، اس علاقے میں گیدڑ بہت ہیں وہی چلّا رہے ہوں گے۔“ عنبر نے کہا۔ ”اب مہربانی کر کے واپس اپنے شاداب نگر چلو۔“

”بہت بہتر میاں۔“ اللہ داد نے انجن سٹارٹ کیا، کار موڑی اور درمیانی رفتار سے شاداب نگر کی طرف روانہ ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک کار کے اندر خاموشی رہی۔ پھر عاقب نے کہا:

”کیا محل کے اندر نیلے بھوت سے ملاقات ہوئی؟“

عنبر نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا:

”نیلے بھوت سے ملاقات بھی انشاء اللہ ہو ہی جائے گی، البتّہ یہ ماننا پڑے گا کہ اس محل میں کچھ نہ کچھ ہے ضرور۔“

”اچھا؟“ عاقب کی آنکھوں سے خون جھانکنے لگا۔ ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ بھُوت محل کے بارے میں جو کہانیاں مشہور ہیں، وہ سب سچی ہیں؟“

”بھئی، ابھی اس بارے میں کچھ فیصلہ کرنا درست نہ ہو گا۔ میں نے اس سلسلے میں کچھ غور کیا ہے۔ ایک دو باتیں ایسی ہیں جن پر کچھ سوچنے کی ضرورت ہے۔“ عنبر نے کہا اور ناخن سے اپنا نچلا ہونٹ نوچنے لگا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ اس کا دماغ کوئی الجھی ہوئی گتھی سلجھانے میں لگا ہوا ہے۔ اللہ داد چپ چاپ موٹر چلا رہا تھا۔ اس نے ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکالا۔

واپسی کا سفر جلد ہی طے ہو گیا۔ اپنے مکان پر پہنچ کر تینوں لڑکے کار سے اُترے۔ عنبر نے اللہ داد کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

”اب تم جاسکتے ہو۔ جس وقت ہمیں کار کی ضرورت پڑے گی، میں تمھیں فون کر دوں گا۔“

اللہ داد سلام کر کے رُخصت ہوا۔ عنبر نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف نگاہ کی۔ رات کے ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔

”ابھی کچھ زیادہ وقت نہیں ہوا ہے۔ تم لوگ چاہو تو ایک پیالی چائے پی کر گھر چلے جانا۔“ اس نے ساتھیوں سے کہا۔

عاقب اور نسیم کا جی اس وقت گھر جانے کو نہ چاہتا تھا۔ شاید وہ ابھی اس انوکھی مُہم پر کچھ بحث کرنے کے موڈ میں تھے۔ عنبر کی خالہ اور خالُو ڈرائنگ روم میں بیٹھے ٹیلے وژن کا کوئی دل چسپ پروگرام دیکھ رہے تھے۔

"خالہ جان، ہم واپس آ گئے ہیں۔" عنبر نے باہر ہی سے اپنے آنے کی خبر دی۔ "اور اب اپنے ہیڈ کوارٹر میں جا رہے ہیں۔ مہربانی فرما کر وہاں کوئی نہ آئے۔ ہمیں ایک ایک اہم مسئلے پر غور کرنا ہے؟"

"ارے! تو کیا کھانا نہیں کھاؤ گے؟" خالہ نے کہا۔ "شام کی چائے بھی تم لوگوں نے غارت کر دی۔ اب کھانے کا وقت ہوا تو پھر وہیں ہیڈ کوارٹر میں جا گھسے۔ میں نے تمھیں منع بھی کیا تھا کہ کسی ایسی ویسی جگہ نہ جانا، لیکن تم ہم لوگوں کی سنتے ہی کب ہو۔ اب بھوتوں کا چکر پڑ گیا۔ کل کسی اور دھندے میں کود پڑو گے۔"

"خالہ جان، کھانا بھی کھائیں گے، لیکن اس وقت بھوک بالکل نہیں ہے۔ ہاں اگر ایک ایک پیالی چائے کی مل جاتی تو ساری تھکن اتر جاتی۔ پھر میں آپ کو آسیبی محل کی ایسی دل چسپ کہانی سناؤں گا کہ آپ ٹیلے وژن دیکھنا بھی بھول جائیں

گی۔"

یہ سن کر خالہ جان ہنس پڑیں۔ وہ اپنے بھانجے سے بے حد محبت کرتی تھیں۔ انھوں نے جلدی جلدی عنبر، نسیم اور عاقب کے لیے چائے بنائی۔ چائے پیتے ہی تینوں اپنے ہیڈ کوارٹر میں جا گھسے۔ نسیم کے ہوش ابھی تک ٹھکانے نہیں لگے تھے اور چہرے پر زردی پھیلی ہوئی تھی۔

"کاش ہم ٹیپ ریکارڈر پر وہ پراسرار چیخیں ریکارڈ کر سکتے۔" عنبر نے کہا۔ "ایک بہترین موقع ہم نے کھو دیا۔ آوازیں ریکارڈ کرنے کے بعد پتا چلانا کچھ دشوار نہ ہوتا کہ یہ گیدڑوں کی ہیں یا بدروحوں کی۔ خیر، آئندہ میں ٹیپ ریکارڈ ضرور ساتھ لے جاؤں گا۔"

"میری طرف سے تم آسیبی محل میں ریڈیو اسٹیشن ہی کیوں نہ کھول لو۔" نسیم نے کہا۔

"دن رات وہیں رہنا اور بھوتوں کی چیخیں ریکارڈ کر کر کے سنا کرنا۔ میں باز آیا ایسے پاگل پن سے۔"

عنبر اور عاقب اس کی یہ بات سُن کر اپنی ہنسی نہ روک سکے۔ عنبر نے کہا۔ ”بے شک وہاں جو کیفیّت ہم پر گزری وہ ایسی تھی کہ اچھا خاصا جی دار ہوش و حواس کھو بیٹھتا تم تو پھر بھی بچے ہو۔“

”جی ہاں۔۔۔ اور تم ہو کوئی سو برس کے بُڈّھے خرّانٹ۔۔۔“ نسیم نے منہ بنا کر کہا۔ ”مجھ سے زیادہ تمہارے حواس گُم تھے۔۔۔ اب یہاں بہادری جتا رہے ہو۔“

”یار، اب یہ جلی کُٹی ختم بھی کرو اور مجھے سارا قصّہ شروع سے آخر تک سُناؤ کہ آخر تم لوگوں نے آسیبی محل میں کیا دیکھا سُنا۔“ عاقب نے اُکتا کر کہا۔

تب عنبر نے الف سے لے کر یے تک ساری داستان سنا ڈالی۔ بیچ بیچ میں نسیم بھی لقمے دیتا جاتا تھا۔ خُدا خُدا کر کے یہ کہانی تمام ہوئی۔ عاقب کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھٹی ہوئی تھیں اور منہ کھُلے کا کھُلا رہ گیا تھا۔

بد رُوح کا ٹیلی فون

تینوں سراغ رساں گہری سوچ میں گُم تھے۔ آخر عنبر نے زبان کھولی۔ ”میں اَب بھی اسی بات پر زور دیتا ہوں کہ بھُوت پریت اور آسیب کا دنیا میں کوئی وجود نہیں ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ضیغم خاں کے محل میں چند باتیں ہم نے ایسی دیکھی ہیں جن کے بارے میں عقل دنگ ہے۔ عاقِب، مہربانی کر کے تم کاغذ پنسل سنبھالو اور یہ تمام باتیں نوٹ کرتے چلے جاؤ۔“

عاقب نے عنبر کے حکم کی تعمیل میں جلدی سے کاغذ اور پنسل ہاتھ میں لے لی۔

عنبر نے اپنا نچلا ہونٹ ناخن سے کاٹتے ہوئے کہنا شروع کیا:

"سوال نمبر ایک: جب ہم محل کے دروازے پر پہنچے تو اندر سے پیانو بجنے کی ہلکی ہلکی آواز سنائی دی تھی۔۔ کیا ضیغم خان کی روح پیانو بجا رہی تھی۔

سوال نمبر دو: محل کے اندر فرش پر مٹی جمی ہوئی تھی اور وہاں کسی کے قدموں کے نشان ہمیں دکھائی نہ دیے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ بہت مدّت سے کوئی شخص محل کے اندر داخل نہیں ہوا یا کم از کم ان کمروں میں نہیں گیا جہاں ہم گئے تھے۔ اگر وہاں کوئی قدم رکھتا تو قدموں کے نشان ضرور ملتے۔

سوال نمبر تین: ہال کمرے کی تعمیر خاص طور پہ ایسی ہوئی ہے کہ اگر اُس کے درمیان میں کھڑے ہو کر بات کریں تو بولنے والے کو اپنی ہی آواز کی گونج سنائی دیتی ہے اور یوں لگتا ہے جیسے کوئی اَن دیکھا آدمی کان میں وہی بات کہہ رہا ہو۔ یہ تعمیر کا کمال ہے یا روح کی آواز سنائی دیتی ہے؟

سوال نمبر چار: نسیم سراغ رساں نمبر دو کا بیان ہے کہ اُس نے ہال کے ساتھ والے چھوٹے کمرے میں قزّاق کی تصویر دیکھی جس کی ایک ہی آنکھ تھی۔

دوسری آنکھ پر آرٹسٹ نے کالی پٹّی بندھی ہوئی دکھائی ہے۔ نسیم کو شُبہ ہے کہ قزّاق کی تصویر نے دو تین مرتبہ اپنی پلک جھپکائی تھی۔ سوال یہ ہے کہ کیا کاغذ پر رنگوں اور برش سے بنی ہوئی کسی انسان کی بے جان آنکھ پلک جھپکا سکتی ہے؟

سوال نمبر پانچ: ابھی ہم دونوں اُسی آسیبی محل کے چھوٹے کمرے میں کھڑے تھے کہ ہم نے یکایک بے پناہ سردی محسوس کی، حالانکہ اس سے پہلے ہم نے سردی تو درکنار، ٹھنڈی ہوا کا کوئی جھونکا بھی اُدھر آتے ہوئے محسوس نہیں کیا۔ سوال یہ ہے کہ ٹھنڈ کی وہ لہر کہاں سے آئی تھی؟ کیا اُدھر سے کوئی روح گزری تھی؟

سوال نمبر چھ: پھر ہم نے اس کمرے میں اچانک سُرمئی رنگ کا دُھواں پھیلتے دیکھا۔ دُھواں پورے کمرے میں چھا گیا اور تمام چیزیں ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔ سوال یہ ہے کہ وہ پر اسرار دُھواں کہاں سے آیا؟

سوال نمبر سات: جب ہم دونوں ڈر کر وہاں سے بھاگے تو نسیم کا بیان ہے کہ کسی اَن دیکھے آدمی نے ہمارا پیچھا کیا۔ وہ آدمی تھا یا بھوت، یا محض ہمارا وہم؟

سوال نمبر آٹھ: جب ہم کار کے قریب پہنچ چکے تھے تو محل کی جانب سے نہایت ڈراؤنی چیخیں سُننے میں آئیں۔ یہ چیخیں جنگلی گیڈروں کی تھیں یا بھوتوں کی؟ ہمیں اب انہی آٹھ سوالوں کا تسلّی بخش جواب ڈھونڈنا ہے اور اس کا یہی طریقہ سب سے بہتر ہے کہ ہم ایک بار پھر آسیبی محل کا معائنہ کریں اور دیکھیں کہ۔۔۔۔“ عنبر ابھی اپنی بات مکمّل کرنے نہ پایا تھا کہ ہیڈ کوارٹر میں لگے ہوئے پرائیویٹ ٹیلے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

وہ تینوں سکتے کے عالم میں اپنی جگہ دم بخود بیٹھے فون کو گھور رہے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ان کے ہیڈ کوارٹر کے فون کی گھنٹی بجی تھی۔ ابھی ایک ہفتہ پہلے ہی عنبر نے اپنے نام سے یہ نیا ٹیلے فون لگوایا تھا۔ ویسے اس کے گھر میں ایک فون پہلے سے موجود تھا، لیکن وہ اپنے خالُو کا فون استعمال کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے بھاگ دوڑ کر کے اپنا ذاتی ٹیلے فون لگوایا تھا۔ اس وقت ان تینوں کے علاوہ کسی چوتھے آدمی کو اس نئے ٹیلے فون کا نمبر بھی معلوم نہ تھا۔ نئی ڈائریکٹری چھپنے میں ابھی چھ ماہ پڑے تھے اور جب وہ چھپ کر آتی تھی لوگوں کو پتا چلتا کہ عنبر کے

نام پر بھی ایک فون لگا ہوا ہے۔

گھنٹی مسلسل بج رہی تھی اور وہ پاگلوں کی طرح فون پر نظریں جمائے بیٹھے تھے۔ آخر نسیم نے کہا۔

"میرا خیال ہے ہمیں فون سُن لینا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔ میں سنتا ہوں۔۔۔ ویسے سخت تعجّب ہے کہ اس نمبر کا پتا کسی کو کیسے معلوم ہوا۔ ممکن ہے مانگ نمبر ہو۔"

اس نے ہاتھ بڑھا کر رسیور اٹھا لیا:

"ہیلو۔۔۔" یہ کہتے ہی عنبر نے قریب رکھے ہوئے ایک مائیکروفون اور سپیکر کا بٹن بھی دبا دیا۔ یہ آلہ عنبر نے خود پرانے ریڈیو کے کُل پُرزے جوڑ کر اس لیے تیّار کیا تھا کہ باہر سے جو شخص بھی فون کرے، اُس کی آواز تینوں لڑکے سپیکر پر سُن سکیں۔

"ہیلو۔۔۔!" عنبر نے ایک بار پھر کہا لیکن دوسری طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔

آخر اس نے ریسیور دوبارہ کریڈل پر رکھ دیا۔ نسیم نے کہا:

"تمہارا اندازہ درست ہے۔ کسی نے کہیں اور فون کیا ہو گا اور گھنٹی یہاں بجنے لگی۔ اکثر ایسا ہو جاتا ہے۔"

ٹیلے فون کی گھنٹی دوبارہ بجی۔ عنبر نے جلدی سے ریسیور اٹھایا اور کہا۔ "ہیلو! کون صاحب ہیں؟"

خواب میں خاموشی تھی، البتّہ انہوں نے سپیکر پر چند عجیب و غریب آوازیں ضرور سُنیں۔ ان میں سے ایک آواز کے ہلکے سُروں میں پیانو بجنے کی بھی تھی۔ پھر ایسا لگا جیسے بہت دُور۔۔۔ میلوں دُور سے گیدڑوں یا کتّوں کے بھونکنے کی آوازیں آرہی ہیں۔۔۔ اس کے بعد ایک غیر انسانی آواز۔۔۔ رونگٹے کھڑے کر دینے والی۔۔۔ آواز آئی۔ یوں لگا جیسے کوئی گہرے کنویں میں سے بول رہا ہو یا بولنے کی کوشش کر رہا ہو، اور آواز حلق میں سے نہ نکلتی ہو۔ عنبر اور اس کے ساتھیوں کے دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی۔

"ہیلو! ہیلو! آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ ذرا اونچی آواز میں بولیے۔" عنبر نے کہا۔

”دور۔۔۔“ وہ پراسرار آواز ان کے سپیکر پر گونجی۔ ”دور۔۔۔ دور رہو۔۔۔ ادھر۔۔۔ مت آؤ۔۔۔ ادھر۔۔۔ مت۔۔۔ آؤ۔۔۔“ پھر یہ آواز مدھم ہوتی چلی گئی۔ اس کے بعد وہی پیانو بجنے اور گیدڑوں کے چلّانے کی آواز سنائی دینے لگی۔ عنبر نے فون بند کر دیا۔ نسیم اور عاقب آنکھیں پھاڑے ابھی تک سپیکر کو گھور رہے تھے۔

عنبر نے ایک گہرا سانس لیا اور کہا۔ ”کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ آخر یہ فون کرنے والا تھا کون اور ہم سے کیا کہنا چاہتا تھا؟ دُور رہو۔۔۔ ادھر مت آؤ۔۔۔ سوال یہ ہے کہ ہم کس چیز سے دُور رہیں اور کدھر نہ جائیں؟“

”میرا خیال ہے کسی نے مذاق کیا ہے۔“ نسیم نے کہا۔

عاقب نے انکار میں گردن ہلائی۔ ”نہیں۔۔۔ یہ مذاق نہیں تھا۔۔۔ خدا کی پناہ! وہ آواز کسی انسان کی نہیں لگتی تھی۔۔۔“

”ممکن ہے ضیغم خاں کی رُوح نے فون کیا ہو۔“ بے اختیار نسیم کے منہ سے یہ جملہ نکل گیا اس نے فوراً ہی کن اکھیوں سے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا مگر عنبر کا

چہرہ بے حد سنجیدہ تھا۔ اس کی آنکھیں کسی گہری سوچ کا پتا دیتی تھیں اور دایاں ہاتھ برابر نچلے ہونٹ کو نوچنے میں مصروف تھا۔ اس نے دوبارہ ایک لمبا سانس لیا اور بولا:

"تم ٹھیک کہتے ہو نسیم۔ یہ فون ضرور ضیغم خاں کی رُوح ہی نے کیا تھا۔ اب اُس کے اس جملے کا مطلب بھی میری سمجھ آ گیا ہے۔ یقیناً اس نے ہمیں تنبیہہ کی ہے کہ محل سے دور رہیں اور اِدھر نہ جائیں۔۔۔ عاقب مہربانی کر کے نواں سوال بھی لکھ لو کہ کیا روحیں ٹیلے فون پر بات کیا کرتی ہیں؟ ہمیں یہ معمّا بھی حل کرنا ہے۔"

اگلے روز ہیڈ کوارٹر میں تینوں سراغ رساں پھر سر جوڑے بیٹھے تھے اور ان سوالوں کا حل تلاش کرنے کی کوشش کر رہے تھے جو عنبر نے عاقب کو کاغذ پر لکھوائے تھے۔ نسیم اور عاقِب کو اب پورا یقین ہو چکا تھا کہ ضیغم خاں کا محل بد رُوحوں اور بھوتوں کا ڈیرا ہے اور وہاں جانا اپنے آپ کو خطرے میں ڈالنے کے برابر ہے۔

لیکن عنبر کی رائے اپنے ساتھیوں سے مختلف تھی۔ وہ بار بار یہی کہتا تھا کہ چلو مان لیا، تم لوگ ٹھیک کہتے ہو، مگر مجھے یہ سمجھا دو کہ آخر رُوح کو ہمیں فون کرنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی؟ اوّل تو یہی بات عجیب ہے کہ روحیں آدمیوں کو ٹیلے فون کریں۔ آخر انہیں آدمیوں سے ڈرنے اور خوف کھانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ دوسری عجیب بات یہ ہے کہ آخر وہ کب سے ہماری اتنی ہمدرد ہو گئیں کہ میں بھوت محل سے دور رہنے کی نصیحت کریں۔ اس کی تہہ تک پہنچنے کے لیے ہمیں خاصی محنت کرنی ہو گی اور اس معمّے کا حل تلاش کرنا ہو گا۔ ہمیں روح کا چیلنج قبول کرنا پڑے گا۔ سوال یہ ہے کہ آخر ہم ضیغم خان کے محل سے دور کیوں رہیں؟ ہمارے وہاں جانے سے کسی کو کیا خطرہ ہے؟ بس میں اسی سوال کا جواب معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"

تم جواب معلوم کرتے رہو اور خدا کے لیے ہمیں بخش دو۔" نسیم نے کہا۔ "میں تو بھوتوں پر ایمان لے آیا اور اب ادھر کا رُخ بھی نہیں کروں گا۔"

عنبر نے نسیم کی بات پر دھیان دیے بغیر کہا۔ "دراصل ہماری معلومات ابھی

ادھوری ہیں۔ ہمیں ضیغم خاں کے بارے میں کچھ جاننے کی ضرورت ہے۔ کوئی ایسا شخص جو اس سے بہت قریب رہا ہو، وہ ہمیں بہت سی باتیں بتا سکتا ہے۔ ایک شخص کا نام میرے ذہن میں بار بار آتا ہے۔"

"وہ کون؟" عاقِب اور نسیم نے ایک زبان ہو کر پوچھا۔ "تم ہی نے اس ذکر کیا تھا عاقِب۔" عنبر نے مسکرا کر کہا۔ عاقب کی بھنویں تن گئیں۔ اس نے کہا:

"میں نے ذکر کیا تھا؟ مجھے تو یاد نہیں۔"

"میں یاد دلائے دیتا ہوں۔" عنبر برابر مسکرا رہا تھا۔ "اس شخص کا نام ہے شاہ باز خاں۔ وہ ضیغم خان کا دوست بھی تھا، سیکریٹری بھی اور مینجر بھی۔ کہو، یاد آیا؟"

"ہاں، یاد آ گیا۔ اُفّوہ، اس کا نام تو میرے ذہن ہی سے اُتر گیا تھا۔" عاقب نے اُچھل کر کہا۔ "بے شک۔ وہی ایسا آدمی ہے جو ہمیں ضیغم خاں کے بارے میں بہت سی ایسی باتیں بتا سکتا ہے جو ابھی تک دوسروں کو معلوم نہیں ہیں، مگر سوال یہ ہے کہ شاہ باز خان کو تلاش کیسے کیا جائے؟ کیا پتا، وہ زندہ بھی ہے یا مر گیا کیوں کہ یہ تو بہت برس پہلے کا قصّہ ہے۔"

”خدا کرے وہ زندہ ہو۔“ عنبر نے کہا۔ ”بہر حال یہ دیکھو میں نے اس کی ایک تصویر حاصل کر لی ہے۔ یہ کسی پُرانے اخبار میں چھپی تھی۔ اس تصویر میں دو آدمی ایک دوسرے سے ہاتھ ملا رہے ہیں۔ ایک کا قد لمبا ہے اور دوسرے کا چھوٹا۔ لمبے آدمی کے سر پر بال نہیں ہیں۔ اس کی چندیا بالکل صاف ہے۔ غور سے دیکھنے پر زخم کا ایک گہرا نشان بھی اس کی گردن پر نظر آتا ہے۔ چھوٹے قد والا مُسکرا رہا ہے اور اس کے سر پر بڑے بڑے بال ہیں۔ یہی شخص شاہ باز خاں ہے۔“

”اور وہ دوسرا لمبے قد کا آدمی کون ہے؟“ نسیم نے پوچھا۔ ”میرا خیال ہے، وہ ضیغم خاں ہو گا۔“ عنبر نے جواب دیا۔ ”ذرا دیکھنا اس تصویر کے نیچے ان دونوں کے نام بھی چھپے ہوئے ہیں۔ بہر حال، ان دونوں میں سے ایک ضیغم خان ہے اور ایک شاہ باز خاں۔ بہت کم لوگ ایسے ہیں جنہوں نے ضیغم خاں کی اصلی شکل کبھی دیکھی ہو گی۔ عام طور پر وہ مختلف روپ اور الگ الگ بھیس بنائے رکھتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسے پہچاننا خاصا دشوار کام ہے۔“

”خیر، یہ بحث تو بعد میں بھی ہوتی رہے گی۔ اب سوال یہ ہے کہ اس شخص شاہ باز کو کہاں ڈھونڈا جائے؟“ عاقب نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اسے ڈھونڈنا آسان ہے۔“ عنبر نے کہا ”ذرا تکلیف کر کے وہ سامنے الماری میں رکھی ہوئی ٹیلی فون ڈائریکٹری اٹھالو۔ مجھے یقین ہے شاہ باز خان کے گھر ٹیلی فون ضرور لگا ہو گا۔“

نسیم نے لپک کر ڈائریکٹری اٹھالی اور جلدی جلدی اس کے ورق الٹنے لگا۔ چند لمحوں بعد وہ خوشی سے چلّایا۔ ”مل گیا۔۔۔ موجود ہے۔۔۔ شاہ باز خاں ۹۱۸ شبستان روڈ نیا نگار آباد۔ ٹیلی فون نمبر چار، ایک، تین، تین، چھ، پانچ۔ کہو تو اس نمبر پر فون کروں؟“

”نہیں۔۔۔ میری رائے میں ہم اُسے بغیر اطلاع دیے اچانک ملیں تو زیادہ بہتر ہے۔ ممکن ہے پہلے فون کر دینے سے وہ تمہیں ٹال دے یا ملنے ہی سے انکار کر بیٹھے۔ ہاں، میں ڈرائیور اللہ داد کو فون کیے دیتا ہوں کہ وہ کار لے کر فوراً آ جائے۔“

”ٹھیک ہے۔“ عاقِب نے کہا۔

عنبر اللہ داد ڈرائیور کو فون کر رہا تھا تو نسیم نے آہستہ سے کہا۔ ”فون تو تم یوں کر رہے ہو جیسے کار تمہاری اپنی ہے۔ جب ایک مہینہ ختم ہو جائے گا، پھر بولو، کیا کرو گے؟“

”اس وقت خدا کوئی اور انتظام کر دے گا۔ آخر تم کیوں اِس فکر میں دُبلے ہوئے جاتے ہو؟“ عنبر کی طرف سے عاقب نے جواب دیا۔

”جب تم کسی بات کو سمجھا نہ کرو تو اس میں دخل دینا کیا ضروری ہے۔“ عنبر نے نسیم سے کہا۔ ”اچھا، اب یہ مذاق چھوڑو۔ اللہ داد کار لے کر آتا ہی ہو گا۔ اتنے میں ہم تینوں کچھ کھا پی لیں۔ خدا جانے شاہ باز خاں کو ڈھونڈنے، اس سے ملنے اور بات چیت کرنے میں کتنی دیر لگے۔“

اللہ داد نے اِدھر کار کا ہارن دیا، ادھر تینوں لڑکے ناشتا کر کے ہیڈ کوارٹر سے باہر نکلے۔ سیاہ مرسیڈیز گاڑی شیشے کی طرح چمک رہی تھی۔ بڑے ٹھاٹ سے وہ تینوں آرام دہ سیٹوں میں دھنس گئے۔ اللہ داد نے انجن سٹارٹ کیا اور عنبر سے پوچھا:

”کدھر چلوں میاں؟“

عنبر نے اسے شاہ باز خاں کے گھر کا پتا بتایا۔

”نیا نگار آباد؟“ اللہ داد نے ایک لمحے کے لیے دماغ پر روز دیا۔ پھر گردن ہلا کر بولا۔ ”ہاں، یاد آیا۔ نیا نگار آباد تو اس طرف ہے جہاں ہم پہلے بھی جا چکے ہیں۔“

”کیا مطلب؟“ نسیم نے پوچھا۔

”مطلب یہ کہ ہمیں اس سڑک پر جانا ہو گا جہاں وہ آپ کا آسیبی محل ہے۔“ اللہ دار نے بتایا۔ یہ سنتے ہی نسیم کے ہوش اُڑ گئے۔ گھبرا کر بولا:

”اللہ داد! گاڑی روک لو۔ مجھے اتار دو۔ پھر جہاں تمہارا جی چاہے چلے جانا۔ مجھے اب بھُوتوں اور آسیبوں سے کوئی دل چسپی نہیں رہی۔“

نسیم کی گھبراہٹ دیکھ کر اللہ داد ہنسا اور کہنے لگا ”واہ میاں واہ! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ اطمینان رکھیے۔ دن کے وقت بھوت یا آسیب کسی کو تنگ نہیں کرتے۔ وہ تو آدھی رات کے بعد ہی نکلا کرتے ہیں۔“

"اجی دن ہو یا رات، مجھے بخشو۔ میں باز آیا۔" نسیم نے کہا۔ "اگر گاڑی نہیں روکو گے تو میں دروازہ کھول کر چھلانگ لگا دوں گا۔"

اللہ داد نے فوراً بریک لگا کر گاڑی روک لی۔ نسیم اُٹھنے کے لیے تیّار ہوا ہی تھا کہ عنبر اور عاقب نے اسے دبوچ لیا۔ نسیم نے بہت ہاتھ پیر مارے، مگر ان دونوں کی گرفت بڑی سخت تھی۔ نسیم کی کوئی پیش نہ گئی۔

"اللہ داد کار پوری رفتار پر چھوڑ دو۔" عنبر نے حکم دیا۔

"بہت بہتر میاں۔" یہ کہتے ہی اللہ داد نے کار چلا دی تھوڑی دیر بعد ان کی نئ طاقت ور مرسیڈیز چمکیلی سڑک پر ستّر میل فی گھنٹے کی رفتار سے سائیں سائیں کرتی دوڑ رہی تھی۔ شہر سے باہر نکلتے ہی نسیم چُپ چاپ بیٹھ گیا اس نے دیکھ لیا تھا کہ عنبر اور عاقِب کے سامنے وہ بالکل بے بس ہے۔ ویسے بھی اسے ان دونوں کو تنگ کرنے میں مزا آتا تھا۔

کار پہاڑی علاقے میں پہنچ گئی۔ حدِّ نظر تک کالی چٹانیں سر اُٹھائے کھڑی تھیں۔ اللہ داد نے رفتار نہایت کم کر دی۔ اب گاڑی پندرہ میل فی گھنٹے کی رفتار سے چل

رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ اس مقام پر پہنچ گئے جہاں پچھلے روز ایک بڑے پتھّر نے سڑک روک رکھی تھی۔ اس دوران میں سڑکوں کی دیکھ بھال کرنے والے محکمے کے آدمیوں نے شاید وہ پتھّر وہاں سے ہٹا دیا تھا۔

دن کی روشنی میں وہ جگہ اتنی ڈراؤنی نظر نہ آتی تھی۔ وہاں سے کوئی ایک میل آگے دائیں جانب سڑک مُڑ کر نئے نگار آباد کو جاتی تھی۔ دور سے بھُوت محل کی بُرجیاں دیکھ کر نسیم نے جھُرجھُری لی اور آنکھیں بند کر کے جَل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تُو کا وظیفہ شروع کر دیا۔

اب چٹانیں ختم ہو گئی تھیں اور کھلا میدان آ رہا تھا۔ سڑک کے دونوں جانب خوب صورت بنگلے بنے ہوئے تھے۔ اللہ داد نے ایک جگہ رُک کر ۹۱۵ شبستان روڈ کا پتا پوچھا۔ معلوم ہوا کہ نمبر ۹۱۵ ابھی دور ہے۔ اللہ داد نے کار آگے بڑھا دی۔ ایک ایک کر کے تمام مکان اور بنگلے پیچھے رہ گئے۔ پہاڑی علاقہ پھر شروع ہوا۔ اب کہیں کچے پکے مکان دکھائی دیتے تھے۔ سڑک ایک لمبا موڑ کاٹ کر مغرب کی طرف بڑھ رہی تھی اور شاہ باز خان کے مکان کا دُور دُور نام و نشان نہ

تھا یہاں تک کہ ایک مقام ایسا آیا جہاں سڑک بالکل بند تھی۔

"لاحول ولا قوۃ۔" نسیم نے کہا۔ "آگے سڑک ہی غائب ہے۔ میرا خیال ہے یہاں سے ہم کوئی ہیلی کاپٹر پکڑیں اور آگے کا سفر اس پر طے کریں؟"

"فضول مت بکو۔" عنبر نے اسے ڈانٹا۔ پھر وہ تینوں کار سے اُتر آئے اور حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ ایک چھوٹی سی پگڈنڈی پہاڑی کے گرد چکّر کھاتی ہوئی اوپر جا رہی تھی۔ اس پر کار لے جانا خطرناک تھا۔

"میرا خیال ہے شاہ باز خان کا مکان اسی پہاڑی کے پیچھے ہوگا۔"

عنبر نے کہا۔ "عاقب، تم یہیں اللہ داد کے ساتھ کار کے پاس رکو۔ میں اور نسیم اوپر جا کر دیکھتے ہیں۔"

یہ کہہ کر عنبر نے نسیم کو آگے دھکا دیا اور وہ منہ بسورتا ہوا چلا۔ ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے دیکھا کہ وہ تنگ سی پگڈنڈی ایک موڑ سے نکلتے ہی خاصی چوڑی اور پختہ سڑک میں تبدیل ہو گئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ جان بوجھ کر

پگڈنڈی کا اتنا ٹکڑا کچا اور تنگ رکھا گیا ہے۔

"وہ رہا نمبر ۹۱۵۔" نسیم نے ایک چھوٹے خوب صورت مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ مکان کے باہر کچھ جھاڑیاں، پودے، گھاس پھونس اور ایک دو درخت بھی اُگے ہوئے تھے۔ لکڑی کا چھوٹا سا گیٹ کھلا تھا۔ جب یہ اس کے نزدیک گئے تو وہاں لیٹر بکس بھی دکھائی دیا۔ اس پر لکھا تھا:

شاہ باز خان۔ ۹۱۵ شبستان روڈ نیا نگار آباد۔

یہ مکان بھی پہاڑی کے اوپر بنایا گیا تھا اور بڑے دروازے تک پہنچنے کے لیے پتھر کی کئی سیڑھیاں بھی بنی ہو تھیں۔ عنبر اور نسیم نے پلٹ کر نیچے دیکھا۔ وہ خاصی اونچائی پر آ گئے تھے اور وہاں سے انہیں مرسیڈیز کار ایک چھوٹے سے کھلونے کی مانند نظر آ رہی تھی۔

یکایک ان کے کانوں میں بے شمار طوطوں کے چیخنے کی آواز آئی۔ انہوں نے دیکھا کہ مکان کی شمالی دیوار کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے کئی پنجرے رکھے ہیں۔ ان پنجروں میں بند سینکڑوں نہیں، ہزاروں خوب صورت طوطے پھڑ پھڑا رہے

ہیں۔ چھوٹے چھوٹے طوطے جن کے رنگ بے حد حسین تھے۔ کوئی لال، کوئی نیلا، کوئی زرد اور کوئی سفید۔

"خدا کی پناہ! اس قدر طوطے۔" نسیم نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے، شاہ باز خاں کو طوطوں سے بڑی دلچسپی ہے۔"

وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ان پنجروں کے قریب جا کھڑے ہوئے اور طوطوں کو غور سے دیکھنے لگے، دفعتہً ان کے پیچھے سے کسی کے چلنے کی آواز آئی۔ وہ فوراً مڑے۔ ایک آدمی لمبے لمبے ڈگ بھرتا انہی کی طرف آ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر نسیم اور عنبر کا کلیجا اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ پتھّر کے بے جان بتوں کی طرح اپنی جگہ یوں کھڑے تھے جیسے زمین نے ان کے پاؤں پکڑ لیے ہوں۔

آنے والا لمبے قد اور مضبوط جسم کا آدمی تھا۔ اس کا سر بالوں سے خالی تھا اور گنجی کھوپڑی خوب چمک رہی تھی۔ اس نے آنکھوں پر گہرے سیاہ شیشوں کی عینک چڑھا رکھی تھی۔ گلے پر ایک گہرے زخم کا نشان صاف دکھائی دے رہا تھا جو بائیں کان تک ایک لکیر کی صورت میں کھنچا ہوا تھا۔ زخم نے اس شخص کی شکل و

صورت خاصی خوف ناک بنا دی تھی۔ اس نے گرج دار آواز میں کہا:

”خبر دار! جہاں کھڑے ہو، وہاں سے ایک انچ نہ ہلنا۔“

نسیم اور عنبر کا خون اسے دیکھ کر پہلے ہی خشک ہو چکا تھا، رہی سہی جان وہ لمبا چمک دار خنجر دیکھ کر نکل گئی جو اس لمبے تڑنگے، گنجے اور خوف ناک آدمی کے دائیں ہاتھ میں تھا۔ اس نے پھر کہا۔

”دیکھو، میں پھر کہتا ہوں، ذرا جنبش نہ کرنا، ورنہ مارے جاؤ گے۔۔۔ بس اس طرح کھڑے رہو۔۔۔ اگر اپنی جان کی سلامتی چاہتے ہو تو حرکت مت کرنا۔“

شاہ باز خاں

وہ مختصر سا لمحہ نسیم اور عنبر کو صدیوں کے برابر لگا۔ ان کے دلوں نے دھڑکنا شاید بند کر دیا تھا اور جسم کا تمام خون کھنچ کر ان کے چہروں پر آرہا تھا۔ پھر اُن کے دیکھتے دیکھتے گنجے نے خنجر والا ہاتھ اُوپر اٹھایا اور پوری قوّت سے نسیم اور عنبر کی طرف پھینکا۔

خنجر اس کے ہاتھ سے سنسناتا ہوا نکلا اور ان دونوں کے درمیان میں سے ہوتا ہوا کھٹاک سے کچّی زمین میں کھُب گیا۔ بے اختیار ہو کر ان دونوں نے گردنیں

گھمائیں اور اس جگہ نظر ڈالی جہاں خنجر زمین میں گڑا تھا۔ پھر حیرت اور خوف سے ان کی آنکھیں پھیل گئیں۔ خنجر ایک کالے رنگ کے پھنیر سانپ کی گردن میں لگا تھا اور تڑپتے ہوئے ناگ کی زخمی گردن سے سُرمئی اور سرخ رنگ کا ملا جلا خون اُبل رہا تھا۔

"لڑکو خدا کا شکر ادا کرو کہ تمہاری جان بچ گئی۔ اگر میرا نشانہ خالی جاتا تو یہ خطرناک سانپ تم میں سے کسی کو ڈس لیتا۔ جانتے ہو یہ ناگ ہے۔ اس کا کاٹا پانی بھی نہیں مانگتا۔"

یہ کہہ کر اس شخص نے ایک پتھّر اٹھایا اور اس سے ناگ کا سر اچھی طرح کچل دیا۔ نسیم اور عنبر پر اس قدر دہشت طاری تھی کہ کئی منٹ تک ایک لفظ بھی ان کے منہ سے نہ نکل سکا۔ گنجے نے کالے شیشوں کی عینک آنکھوں سے اتاری اور پلکیں جھپکتے ہوئے ان دونوں کو مُسکرا مُسکرا کر دیکھنے لگا۔ عنبر نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں کا رنگ گہرا ابھورا ہے اور ان میں خاصی چمک ہے۔

"جناب، ہمارے پاس آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔" عنبر نے

کہا۔ ”واقعی یہ زہریلا ناگ کاٹ لیتا تو ہمارا بچنا محال تھا۔“

گنجے نے اپنی جیب سے سرخ اور سفید رنگ کا ریشمی رومال نکالا اور اسے اپنی گردن پر لپیٹ لیا۔ اس طرح زخم کا وہ نشان چھُپ گیا جس نے اس کی شکل خوف ناک بنادی تھی۔ اس نے جواب دیا۔

”میں مکان کے پرلی طرف اس خنجر سے جھاڑیاں کاٹ رہا تھا کہ ایک دم یہ ناگ اُن جھاڑیوں میں سے رینگتا ہوا نکلا اور تیزی سے اِدھر آ گیا۔ یہ پہلے بھی میرے کئی پالتو طوطے مار چکا ہے۔ میں خود اس کی تاک میں تھا۔ بہرحال یہ باتیں تو بعد میں ہوتی رہیں گی۔ یہ بتاؤ کہ تم لوگ کون ہو اور اِدھر کیسے آ نکلے؟“

”کیا آپ ہی کا نام شاہ باز خاں ہے؟“ عنبر نے پوچھا۔

گنجے کی پیشانی پر گہری لکیریں نمودار ہوئیں۔ شاید وہ اس سوال کی توقع نہ رکھتا تھا۔ چند سیکنڈ چُپ رہنے کے بعد اس نے اقرار میں گردن ہلائی اور جواب میں کہا:

”ہاں، مجھے ہی شاہ باز خان کہتے ہیں۔ شاید تم لوگوں نے میرا نام لیٹر بکس پر لکھا دیکھا ہے؟“

”بے شک، آپ کا نام لیٹر بکس پر بھی دیکھا ہے۔“ عنبر نے کہا۔ ”مگر ہم اس سے بھی پہلے آپ کا نام اخباروں اور رسالوں میں دیکھ چکے ہیں۔ کیا آپ وہی شاہ باز خاں ہیں جو کسی زمانے میں مشہور اداکار ضیغم خان کے دوست اور سیکرٹری تھے!“

”ہاں لڑکو، میں وہی بد نصیب ہوں۔ ضیغم خاں میرا پُرانا اور عزیز دوست تھا۔ جب سے اس نے خودکُشی کی میری دنیا اس کے محل کی طرح ویران پڑی ہے۔“ یہ کہتے اس کی آواز بھرّا گئی۔ اس نے جیب سے دوسرا رومال نکال کر اپنی بھیگی پلکیں صاف کیں۔

”اگر مجھے ذرا بھی احساس ہوتا کہ وہ خودکُشی کرنے کا ارادہ کر رہا ہے تو میں شاہد اسے یہ بھیانک قدم اٹھانے سے روک دیتا۔۔۔ مگر افسوس۔“

”جناب، میں معافی چاہتا ہوں کہ آپ کو مرحوم ضیغم خاں کی یاد دلا کر خواہ مخواہ

غمگین کر دیا۔ میرا نام عنبر ہے اور یہ میرا دوست نسیم ہے۔ ہمارا ایک اور دوست عاقِب بھی ہے جو یہاں سے کچھ فاصلے پر کار میں بیٹھا ہے۔ ہم خاص طور پر آپ سے ملاقات کرنے آئے ہیں۔ یہ ہے ہمارا ملاقاتی کارڈ۔"

عنبر نے چھپا ہوا کارڈ نکال کر شاہ باز خان کو دیا۔ اس نے بڑی حیرت سے کارڈ پر لکھی ہوئی عبارت اور نام پڑھے۔ پھر نسیم اور عنبر کو اُوپر سے نیچے تک غور سے دیکھنے کے بعد بولا۔

"بہت خوب! بہت خوب! تو بھئی ننھے سراغ رسانو! تم آخر مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟"

"ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا واقعی یہ بات سچ ہے کہ ضیغم خاں کی روح اپنے محل میں موجود ہے یا لوگوں نے کہانیاں گھڑ لی ہیں؟"

شاہ باز خان جت ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اس نے کہا۔ "میاں، تم نے بہت اچھا سوال کیا ہے۔ اسی سے مجھے تمہاری ذہانت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اب میرا جواب سنو۔ میرا دوست ضیغم خاں نہایت عجیب و غریب آدمی تھا۔ ایسا

عجیب و غریب کہ تم اس کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔ فلموں میں وہ ہمیشہ ہیبت ناک اور ڈراؤنے کردار ادا کیا کرتا تھا۔ لوگ سمجھتے کہ وہ بڑا خوں خوار اور ظالم آدمی ہو گا۔ لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی۔

اپنی ذاتی زندگی میں ضیغم خاں بے حد سادہ دل، بچّوں کی طرح بھولا بھالا اور شرمیلا شخص تھا۔ ایسا شرمیلا اور شریف کہ اسے کبھی سے کبھی کسی پر غصّہ تک نہ آتا تھا۔ وہ عام طور پر لوگوں سے ملنے جلنے سے گھبراتا تھا۔ یہی سبب کہ اس نے اپنا سارا کام کاج مجھے سونپ دیا تھا۔

گونگی فلموں کے زمانے میں وہ بہت ہر دل عزیز اداکار تھا۔ لوگ اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے بے تاب رہتے، مگر وہ بہت کم بازار میں نکلتا تھا۔ اس کے بعد جب گونگی فلموں کا زمانہ ختم ہوا اور بولتی فلمیں ایجاد ہوئیں تو اس کی بدقسمتی کا آغاز بھی ہوا۔ اس کی آواز سُن کر لوگوں نے قہقہے لگائے، اس کا مذاق اڑایا اور طرح طرح کی باتیں کہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بے چارے ضیغم خاں کا دل ٹوٹ گیا۔ وہ دنیا میں سب کچھ برداشت کر سکتا تھا، لیکن لوگوں کے طعنے اور توہین سے

بھرا ہوا مذاق برداشت کرنا اس کی طاقت سے باہر تھا۔ اس کے بعد اس نے جو فیصلہ کیا، اس سے تم لوگ اچھی طرح واقف ہو۔ افسوس کہ دنیا ایک بہترین اداکار سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئی۔"

ایک بار پھر شاہ باز خاں کی آواز غم سے بھرّا گئی اور اسے دوبارہ رومال سے اپنی بھیگی آنکھیں صاف کرنی پڑیں۔

"مرنے سے ایک دن پہلے ضیغم خاں نے مجھ سے کہا تھا کہ میری روح ہمیشہ اس محل میں رہے گی اور لوگوں نے مجھ سے جو بدسلوکی کی ہے اس کا انتقام لے گی۔ چنانچہ اس کی روح اپنے ہی بنائے ہوئے محل میں موجود ہے۔ جب وہ زندہ تھا، تب بھی اس کا پیشہ لوگوں کو ڈرانا تھا، اور اب وہ اس دنیا میں نہیں، اس کا کام برابر جاری ہے یعنی لوگوں کو دہشت زدہ کرنا۔"

"جناب، یہ بتائیے کہ اخباروں اور رسالوں میں آسیبی محل کے بارے میں جو عجیب عجیب کہانیاں چھپتی رہی ہیں کیا وہ سچ ہیں؟ مثلاً کہا جاتا ہے کہ وہاں ایک نیلے رنگ کا بھوت بھی دیکھا گیا ہے اور کسی کمرے میں سے پیانو بجے کی آوازیں بھی

سنائی دیتی ہیں؟" عنبر نے پوچھا۔ "بھئی جہاں تک نیلے بھوت کا تعلّق ہے، میں نے وہاں کوئی ایسی چیز نہیں دیکھی۔ البتّہ پیانو کی آواز ضرور سنی ہے۔ ضیغم خاں نے اس محل میں ایک کمرا موسیقی کے لیے بنوایا تھا۔ وہاں مختلف قسم کے ساز جمع کیے تھے۔ ایسے ساز جو خوف ناک آوازیں نکالتے تھے۔ انہی میں ایک بہت بڑا پیانو بھی ہے۔ اگرچہ وہ موسیقی والا کمرا مدّتوں سے بند پڑا ہے مگر اندھیری راتوں میں پچھلے پہر کبھی کبھی پیانو کی آواز اُدھر سے آتی ہوئی میں نے خود سُنی ہے۔ خُدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس میں کیا بھید ہے۔ بہر حال، کوئی مجھے دس لاکھ روپے دے تب بھی میں اس محل میں قدم رکھنے کے لیے تیار نہیں ہوں گا۔"

"اچھا جناب، ہم نے آپ کا وقت بہت لے لیا۔" عنبر نے کہا۔ "اب ہم اجازت چاہتے ہیں۔ آپ نے بہت سی کام کی باتیں بتائیں، ایسی باتیں تو دوسرا کوئی نہیں بتا سکتا تھا اور سب سے بڑا احسان آپ نے ہم پر یہ کیا کہ اس زہریلے سانپ کو مار کر ہماری جان بچائی۔ اس کا تو ہم شکریہ ادا کر ہی نہیں سکتے۔ خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔ مجھے تم سے مل کر خوشی ہوئی۔ جب بھی اِدھر آنا ہو مجھ سے ضرور

ملنا اور ہاں میرا مشورہ یہ ہے کہ آسیبی محل اور ضیغم خاں کا خیال چھوڑ دو۔ اس میں بھی جان کا خطرہ ہے۔"

شاہ باز خان سے ملاقات کے بعد عنبر کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ نسیم نے دیکھا کہ وہ ناخن سے نچلا ہونٹ نوچنے میں مصروف ہے۔ اس نے عنبر کو چھیڑنے کی کوشش نہ کی۔ دونوں دوست چُپ چاپ وہاں واپس آئے جہاں کار کھڑی تھی۔ عاقِب بے چینی سے ان کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے انہیں دیکھتے ہی سوالوں کی بوچھاڑ کر دی:

"شاہ باز خاں سے ملاقات ہوئی؟ کیسا آدمی ہے؟ اس نے کیا بتایا؟ حیران تو بہت ہوا ہو گا کہ آخر اسی محل کے بارے میں اس پوچھ گچھ کا مطلب کیا ہے؟ مجھے سب کچھ تفصیل سے بتاؤ۔ بد روحوں اور بھوتوں کے بارے میں اس کی کیا رائے ہے؟"

"یار، ذرا چھری کے نیچے دم تو لو۔" نسیم نے اُسے ڈانٹا۔ "کیا ساری الف لیلہ یہیں سنو گے؟ ابھی اپنے ہیڈ کوارٹر واپس چلتے ہیں۔ پھر اطمینان سے بیٹھیں گے۔

کیوں عنبر؟"

عنبر ابھی تک گہری سوچ میں گم تھا۔ اس نے اقرار میں گردن ہلائی۔ اللہ داد نے کار موڑی اور شاداب نگر کا رُخ کیا۔ تمام راستے کار میں خاموشی چھائی رہی۔

ابھی وہ ہیڈ کوارٹر میں داخل ہوئے ہی تھے کہ عنبر کی خالہ وہاں آئیں اور کہنے لگیں:

"ارے بیٹا، آج تو عجیب بات ہوئی۔ اِدھر تم لوگ کار میں بیٹھ کر کہیں گئے، اُدھر ایک بوڑھی پگلی عورت یہاں آئی۔ اس کا چہرہ کالا سیاہ تھا، توے کی طرح۔ سفید سفید دانت باہر نکلے ہوئے۔ سر کے بال لمبے لمبے اور بُری طرح الجھے ہوئے تھے۔ آنکھیں زرد اور چہرے پر بے شمار جھُرّیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اس نے عجیب و غریب قسم کا لباس پہن رکھا تھا جیسے آج سے سو دو سو برس پہلے ہمارے ملک کی عورتیں پہنا کرتی تھیں۔ یقین کرو میں تو اسے دیکھ کر ڈر گئی۔ ایسا لگا جیسے سچ مچ کی کوئی چڑیل میرے سامنے آن کھڑی ہوئی ہے۔ اللہ معاف کرے، بالکل چڑیل لگ رہی تھی وہ۔۔۔"

"چڑیل؟" تینوں لڑکوں کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ عنبر نے کہا۔ "لیکن خالہ جان، اس چڑیل کا یہاں کیا کام؟"

"ارے بیٹا، میں نے کہا نا کوئی پگلی تھی بے چاری۔ سیدھی گھر میں گھس آئی اور دیدے گھما گھما کر کہنے لگی کہ اس سے کہہ دینا کیوں اپنی جان خطرے میں ڈالتا ہے۔ اس جگہ سے دور رہ۔۔۔ بس کہہ دیا ہے۔۔۔ اگر اب کے وہ وہاں گیا تو خود بھگتے گا۔۔۔ ہم نے بچّہ سمجھ کر چھوڑ دیا۔ روک لو اسے۔۔۔ پھر بعد میں سر پر ہاتھ رکھ کر روؤ گی۔۔۔ وہ جگہ اس کے جانے کے لائق نہیں۔۔۔ غرض اسی طرح بڑبڑاتی رہی۔ میں نے بہت پوچھا کہ کس کا ذکر کر رہی ہو امّاں جان؟ کسے وہاں جانے سے روکوں؟ کس کی جان خطرے میں ہے؟ لیکن وہ بار بار جملے دہراتی رہی کہ اس سے کہہ دینا۔۔۔ اس جگہ سے دور رہے اب وہاں نہ جائے۔۔۔ ہم نے بچّہ سمجھ کر چھوڑ دیا۔۔۔ روک لو اسے۔۔۔ وہ جگہ اچھی نہیں۔۔۔ بس یہ کہتی ہوئی وہ چلی گئی۔"

عنبر کی خالہ تو اتنا بتا کر اپنے گھر کے کام دھندوں میں لگ گئیں اور اِدھر تینوں

لڑکے حیران پریشان ایک دوسرے کی شکل دیکھ رہے تھے۔ عنبر کے چہرے پر ایک رنگ آتا ایک جاتا۔ وہ بار بار تیزی سے اپنا نچلا ہونٹ، نوچ رہا تھا۔ آخر نسیم نے کہا:

"اجی چھوڑو اسے، ہو گی کوئی پگلی بڑھیا۔ ایسی ایسی نہ معلوم کتنی پاگل شہر میں پھرا کرتی ہے۔ ان کو تو پاگل خانے میں ہونا چاہیے۔ خواہ مخواہ لوگوں کے گھروں میں گھس کر پریشان کرتی ہیں۔"

"نہیں، وہ بڑھیا پاگل نہیں تھی۔" عنبر نے ایک دم کہا۔ "وہ یہ پیغام دینے آئی تھی کہ ہم آسیبی محل سے دور رہیں۔ وہاں جانے میں جان کا خطرہ ہے۔۔۔"

"خدا کی پناہ۔" نسیم چلّایا۔ "اب میں سمجھا۔ میرا تو ذہن ہی اس طرف نہیں گیا۔۔۔ اُف! ممکن ہے وہ بڑھیا واقعی کوئی چڑیل ہی ہو۔۔۔ خالہ جان نے اس کا جو حلیہ بتایا ہے، اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس دنیا کی مخلوق نہ تھی؟"

"اور پھر وہ پراسرار ٹیلے فون۔۔۔" عاقِب نے کہا۔ "وہ آواز بھی کسی انسان کی نہ تھی۔ اب بھی اسے یاد کر کے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ چکّر کیا ہے

یارو اپنی تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر واقعی یہ سب دھندا بد روحوں کا ہے تو پھر میں اپنی جان کی خیر منانی چاہیے۔"

"سوال یہ ہے کہ آخر بد روحوں نے اس سے پہلے کسی اور کو آسیبی محل میں جانے سے روکنے کی کوشش کیوں نہیں کی۔" عنبر نے کہا۔ "ہم لوگوں سے انہیں کیا خطرہ ہے؟"

"اس سوال کا جواب تو بد روحیں ہی دے سکتی ہیں۔ میں کیا عرض کر سکتا ہوں۔" نسیم نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ انہی کو جواب دینا ہو گا۔" عنبر نے اُٹھ کر ٹہلتے ہوئے کہا۔ "کل تُم دونوں سورج چھپنے سے دو گھنٹے پہلے آسیبی محل میں جاؤ گے۔ اور ہاں، ٹیپ ریکارڈ اور فلیش کیمرا ضرور لے جانا۔ وہاں جو کچھ دیکھو اور سنو اس کی تصویریں اور آوازیں تمہارے پاس ہونی چاہیں۔"

"عاقِب اور نسیم دونوں اچھل پڑے۔

”ک۔۔۔ک۔۔۔کیا کہا؟ ہمیں آسیبی محل میں پھر جانا پڑے گا؟“ نسیم نے ہکلا کر کہنا شروع کیا۔ ”مگر۔۔۔۔“

”اگر مگر کچھ نہیں۔ جو میں کہتا ہوں، وہ تمھیں کرنا ہی ہو گا۔“ عنبر نے سنجیدگی سے کہا۔ ”عاقِب نے وہ محل اندر سے نہیں دیکھا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس مرتبہ وہ بھی اس کی سیر کرے۔ گھبرانا مت۔ وہاں تمھیں کوئی بھوت ووت نہیں ملے گا۔“

”لیکن تم بھی ہمارے ساتھ چلو نا۔“ عاقِب نے کہا۔ ”میں بھی چلوں گا۔ لیکن محل کے اندر نہیں جاؤں گا۔ کار میں بیٹھ کر تم دونوں کا انتظار کروں گا۔ بس اب بحث بند۔ کل سہ پہر کو ٹھیک چار بجے یہاں آ جانا، اللہ داد کار لیے موجود ہو گا، ٹیپ ریکارڈر اور فلیش کیمرا ساتھ لیتے آنا۔ جاؤ، خدا حافظ۔“

بُرے پھنسے

سورج غروب ہونے میں ابھی ڈیڑھ گھنٹا باقی تھا۔ عاقِب اور نسیم آسیبی محل کے دروازے پر کھڑے تھے۔ ان کی توقع کے خلاف بڑا دروازہ بند تھا۔ حال آں کہ اس سے پہلے عنبر اور نسیم کو یہ دروازہ کھلا دکھائی دیا۔

”خدا جانے وہ کون سا منحوس دن تھا جب ہمیں سراغ رسانی کا شوق چرایا تھا۔“ نسیم نے منہ بنا کر کہا۔ ”اگر مجھے پہلے خبر ہوتی کہ شروع ہی میں اس کم بخت آسیبی محل سے واسطہ پڑے گا تو میں تم لوگوں کے جھانسے میں نہ آتا۔ اب دیکھیے کیا

دُرگت بنے۔ کیا خبر یہاں سے زندہ سلامت گھر کو واپس جانا نصیب ہوتا ہے یا نہیں۔"

"افوہ! تم تو خواہ مخواہ گھبرائے دیتے ہو۔" عاقِب نے جھنجھلا کر کہا۔ "آخر بھُوت ہمیں ہڑپ کرنے سے تو رہے۔"

"جی، یہ سب تمہارا کیا دھرا ہے جو اب سامنے آرہا ہے۔" نسیم نے بھی تُرکی بہ تُرکی جواب دیا۔ "تم ہی نے پہلے پہل اس منحوس آسیبی محل کا ذکر چھیڑا تھا، اور وہ ہمارے ذہین دوست عنبر صاحب تو ہیں ہی بنے بنائے پاگل۔ بس لٹھ لے کر دوڑ پڑے عقل کے پیچھے یہ کہتے ہوئے کہ عقل بڑی کہ بھینس۔ لاحول ولا قوۃ۔ اب کھڑے کیا سوچ رہے ہو؟ دروازہ کھولو اور اندر چلو۔ اگر بھوتوں نے ہم دونوں کی ہڈّیاں نہ چبائیں ہوں تو نسیم نہیں میرا نام کچھ اور ہی رکھ دینا۔"

"وہ اپنے ساتھ ٹیپ ریکارڈر اور کیمرا بھی لے کر آئے تھے۔ عنبر ان کے ساتھ سڑک کی آخری حد تک آیا تھا اور اب وہیں اللہ داد ڈرائیور سمیت کار میں بیٹھا تھا۔ اس نے ان دونوں کو سختی سے سمجھا دیا تھا کہ سورج غروب ہوتے ہی واپس

چلے آئیں اور خواہ مخواہ وقت ضائع نہ کریں۔

عاقِب کے کندھے پر چمڑے کی پیٹی میں بندھا ہوا کیمرا لٹک رہا تھا اور نسیم کے ہاتھ میں بیٹری سے چلنے والا چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر تھا۔

"یہ دروازہ بند کس نے کیا؟" نسیم نے جیسے اپنے آپ سے کہا اور مجھے خوب یاد ہے جب میں اور عنبر بھوتوں کے ڈر سے بھاگے تھے اس وقت بھی یہ دروازہ چوپٹ کھلا تھا۔ معلوم ہوتا ہے اس دوران میں ضرور کوئی ادھر آیا ہے۔" "ممکن ہے ہوا کے زور سے آپ ہی آپ بند ہو گیا ہو۔" عاقِب نے رائے ظاہر کی۔

نسیم نے ہاتھ بڑھا کر دروازے کا ہینڈل چھوا اور پھر ہلکا سا دھکا دیا۔ دروازے میں سے چر۔۔۔ چرر۔۔۔ چررر۔۔۔۔۔ کی سی ایسی آوازیں نکلی جیسے وہ فریاد کر رہا ہو۔ یہ آواز تھی ہی ایسی کہ ان دونوں کے دل کانپ گئے۔ آخر عاقِب نے حوصلہ کر کے کہا:

"ایسی آوازیں لکڑی کے پرانے دروازوں کی چولوں میں سے آیا کرتی ہیں۔ بھلا ان سے ڈرنے کے کیا معنی؟ آؤ اندر چلو اور یہ ارادہ کر لو کہ دنیا کی کوئی طاقت

ہمیں خوف زدہ نہیں کر سکتی، خواہ وہ بھوت ہو یا بھوت کا باپ؟“

دروازہ کھلا چھوڑ کر وہ دونوں سینہ تانے محل کے ہال کمرے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے دیکھا کہ ہال کمرا پرانے طرز کی میز کرسیوں، الماریوں اور اونچے اونچے پردوں سے بھرا پڑا ہے۔ ہر چیز پر منوں گرد جمی ہوئی تھی۔ عاقِب نے جلدی جلدی اس کمرے کی دو تین تصویریں اتاریں۔ نسیم کی انگلی ٹیپ ریکارڈر کے بٹن پر جمی ہوئی تھی تاکہ جُوں ہی کوئی آواز سنائی دے وہ فوراً اسے ریکارڈ کر سکے۔

”ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم کسی پرانے عجائب گھر میں آ گئے ہیں۔“ عاقِب نے کہا۔

اس کا یہ کہنا تھا کہ ان کے کانوں میں یہی الفاظ گونجنے لگے۔ عاقِب نے گھبرا کر نسیم کی طرف دیکھا۔ وہ ہنسا اور کہنے لگا۔

”تم اس ہال کمرے کے درمیان میں کھڑے ہو، اس لیے تمہاری آواز ہی گونجتی ہے اور یوں لگتا ہے جیسے کوئی ہمارے کانوں میں چپکے چپکے کچھ کہہ رہا ہے۔ جب

پہلی بار میں اور عنبر یہاں آئے تھے تو ہم بھی اپنی ہی آوازیں سن کر بدحواس ہو گئے تھے۔ آؤ، اب دوسرے کمرے میں چلیں۔"

اب وہ اس کمرے میں تھے جہاں انہوں نے ایک آنکھ والے قزّاق کی تصویر دیکھی تھی۔ اس کمرے کے ایک جانب گیلری سی بنی تھی۔ عاقِب نے قزّاق کی تصویر غور سے دیکھتے ہوئے کہا:

"نسیم، ذرا وہ کرسی کھینچ کر اس پر کھڑے ہو جاؤ اور تصویر کو ہاتھ سے چھو کر دیکھو۔ اس کے ساتھ ہی میں تمہاری ایک تصویر اتارنا چاہتا ہوں۔"

نسیم نے ایک کرسی کھینچ کر قزّاق کی تصویر کے میں نیچے رکھی اور اس پر کھڑا ہوا لیکن اس کا ہاتھ اب بھی قزّاق کی آنکھ تک نہیں پہنچ رہا تھا۔ "میرا خیال ہے، ہم گیلری پر چڑھ کر دیکھیں۔" عاقِب نے کہا۔ یہ سن کر نسیم نے کرسی سے اترنا چاہا اور عاقِب اُن سیڑھیوں کی طرف بڑھا جو گیلری پر چڑھنے کے لیے بنائی گئی تھیں۔ جوں ہی وہ مُڑا، اسے یوں لگا جیسے کسی نے اس کے کندھے پر لٹکتے ہوئے کیمرے کی پیٹی پکڑ لی ہو۔ عین اسی لمحے اس نے ایک لمبے تڑنگے آدمی کی ایک

جھلک دیکھی جس نے سر سے پاؤں تک پرانے زمانے کا فولادی زرہ بکتر پہن رکھا تھا۔ لوہے کا مضبوط خُود اُس کے سر پر دھرا تھا اور دائیں ہاتھ میں چمکتی ہوئی تلوار تھی۔

"عاقِب کے حلق سے ایک خوف ناک چیخ نکلی اور وہ بد حواس ہو کر دروازے کی طرف تیزی سے لپکا لیکن ابھی بھاگنے بھی نہ پایا تھا کہ اس ہیبت ناک فولادی انسان کے پاؤں میں کیمرے کی پیٹی پھنس گئی اور عاقِب دھڑام سے منہ کے بل فرش پر گرا۔ اب بے اختیار اس کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخیں نکل رہی تھیں۔ اسی لیے اس نے دیکھا کہ فولادی انسان کے دائیں ہاتھ میں پکڑی ہوئی تلوار تیزی سے نیچے آئی۔ عاقِب اُچھل کر پرے ہٹ گیا اور تلوار زور سے پتھر کے فرش پر لگی۔

عاقِب کا اُچھل کر پرے ہٹنا تھا کہ وہ فولادی انسان ایک دھماکے سے نیچے گرا اور اس کے سر پر چڑھی ہوئی لوہے کی ٹوپی فرش پر لڑھکتی ہوئی ایک کونے میں جا گری۔ اتنی دیر میں عاقِب اپنا کیمرا پرے پھینک کر دیوار سے جا لگا تھا۔ اس کا

خیال تھا کہ اب وہ فولادی انسان دوبارہ اُٹھ کر اس پر حملہ کرے گا لیکن اس نے تو اپنی جگہ سے جنبش ہی نہ کی۔ عاقِب نے غور سے دیکھا تو فوراً ہی ساری حقیقت اس پر روشن ہو گئی۔ لوہے کی زرہ بکتر اندر سے خالی تھی۔ اس میں کوئی آدمی تھا ہی نہیں۔ یہ محض ایک نمائشی چیز تھی۔

عاقِب نے کھسیانا ہو کر نسیم کی طرف دیکھا جو ابھی تک کرسی پر کھڑا دانت نکال رہا تھا۔ پھر اس نے بڑھ کر اپنا کیمرا اٹھایا اور فرش پر گرنے سے کپڑوں پر جو دھول لگ گئی تھی اسے جھاڑنے لگا۔ اس کے بعد اس نے ایک آنکھ والے قزّاق کی تصویر کے ساتھ نسیم کی تصویر اُتاری۔ اُدھر نسیم کے قہقہے تھم ہی نہیں رہے تھے۔ عاقِب نے اس فولادی ڈھانچے کی بھی ایک تصویر اُتار لی جو اصل میں لکڑی کے ایک اونچے سٹینڈ کے سہارے کونے میں کھڑا کیا گیا تھا۔

"اگر تم اچھی طرح ہنس چکے ہو تو آؤ، محل کے دوسرے کمرے بھی جلدی سے دیکھ ڈالیں۔" عاقِب نے دانت پیس کر کہا۔ "ہمیں سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے واپس بھی جانا ہے؟"

”ارے ہاں، یہ بات تو میں بھول ہی گیا تھا۔“ نسیم نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ اب وہ دونوں تیسرے کمرے کے قریب پہنچے۔ اس کا دروازہ بند تھا اور وہاں ایک تختی پر یہ الفاظ لکھے تھے: میوزک رُوم (موسیقی کا کمرا)

”وہ خود بخود بجنے والا پیانو شاید اسی کمرے میں رکھا ہو گا۔“ عاقِب نے کہا۔ ”آؤ ذرا اسے بھی دیکھتے چلیں۔“

”چلو“ یہ کہہ کر نسیم نے زور سے دروازے کو دھکا دیا۔ دھکّا اگرچہ پوری قوّت سے دیا گیا تھا اور دروازے کو فوراً کھل جانا چاہیے تھا، لیکن یہ دیکھ کر ان کے تعجّب کی انتہا نہ رہی کہ دروازہ یوں آہستہ آہستہ کھلا جیسے کوئی اَن دیکھی ہستی اس کے پیچھے پہلے سے چھپی کھڑی تھی اور دروازہ اُسی نے کھولا ہے۔

دروازہ کھلتے ہی اندر سے گرم ہوا کا ایک جھونکا سا آیا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ میوزک روم کا یہ دروازہ مدّت سے بند تھا۔ دونوں نے ڈرتے ڈرتے کمرے میں جھانکا، وہاں گھُپ اندھیرا تھا، ایسا اندھیرا کہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کے باوجود انہیں کچھ نظر نہ آتا تھا۔

”یہاں تو ایسا اندھیرا ہے جیسے ہم کسی زمین دوز تہہ خانے میں آ گئے ہیں۔“ نسیم نے کہا۔ پھر اپنی کمر سے بندھی ہوئی ٹارچ کھول کر روشن کی۔ روشنی کی طاقت ور لہریں کمرے میں پھیل گئیں۔ معلوم ہوا کہ میوزک روم تو خاصا بڑا ہے۔ اس میں کرسیاں اور صوفے ترتیب سے آگے پیچھے یوں رکھے تھے جیسے سنیما ہالوں میں ہوتے ہیں۔ سامنے سٹیج بھی بنا ہوا تھا اور فلم دکھانے کی سکرین بھی تھی۔ اس کا سفید رنگ اب دھول پڑ پڑ کر سُرمئی ہو رہا تھا۔ سٹیج کے دائیں طرف ایک بڑا اور نہایت قیمتی پیانو رکھا تھا۔

”خدا کی پناہ! اتنا بڑا پیانو۔“ نسیم کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ ”ہمارے گھر میں بھی ایک پیانو ہے، لیکن یہ پیانو تو اس سے کوئی دس گنا بڑا ہو گا۔ تبھی اس کی آواز دُور دُور سُنائی دیتی ہے۔ آؤ، اسے قریب سے دیکھیں۔“

عاقِب کے پاس بھی ٹارچ تھی۔ اس نے اپنی ٹارچ کمر سے بندھی ہوئی پیٹی سے کھول کر جلانے کی کوشش کی لیکن وہ نہ جلی۔ شاید وہ اس وقت خراب ہو گئی تھی جب عاقِب فولادی انسان سے اُلجھ کر فرش پر منہ کے بل گرا تھا۔

”میری ٹارچ نہیں جل رہی۔“ عاقِب نے نسیم سے کہا۔ ”خدا جانے اس میں کیا خرابی ہو گئی ہے۔“

”اوہو! اس کی آخر ضرورت ہی کیا ہے۔“ نسیم نے جھنجھلا کر کہا۔ ”میرے پاس جو ٹارچ موجود ہے تمہیں اس کی روشنی میں نظر نہیں آرہا؟“

اب بدروحوں اور بھُوتوں کا خوف ان کے دلوں سے نکل چکا تھا۔ شاید اس کا سبب وہ فولادی انسان تھا جو اندر سے کھلا ثابت ہوا تھا۔ انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ یہ سب وہم کے کرشمے ہیں اور کچھ نہیں۔

پیانو کے آس پاس مکڑیوں نے بے شمار جالے تان رکھے تھے اور ہر چیز خاک دھول میں بُری طرح اَٹی پڑی تھی۔ عاقِب نے اس پیانو کی بھی ایک تصویر اُتاری۔ پھر چاروں طرف نگاہ ڈال کر کمرے کا آخری بار جائزہ لیا۔

”یہاں اور کچھ نہیں۔ چلو، آگے بڑھو۔“ نسیم نے کہا۔

دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے میوزک روم سے باہر نکلے۔ ہال کمرے سے گزرتے

ہوئے اچانک انہیں ایک گوشے میں سیڑھیاں دکھائی دیں۔ ان سیڑھیوں کے اوپر ایک کھڑکی میں سے سورج کی کرنیں اندر آرہی تھیں۔ دھوپ دیکھ کر ان کا حوصلہ اور بڑھ گیا۔

"معلوم ہوتا ہے سورج غروب ہونے میں ابھی دیر ہے، اور ہمارے پاس محل میں گھومنے پھرنے کے لیے خاصا وقت ہے۔" عاقِب نے کہا۔

نسیم کو جیسے ایک دم کوئی بات یاد آگئی۔ اس نے کہا۔ "لاحول ولا قوۃ۔ تمہارے گِرنے کے چکر میں مَیں اس قزّاق کی تصویر کو قریب سے دیکھنا تو بھول ہی گیا۔ آؤ وہیں چلتے ہیں۔ مجھے اب بھی یقین ہے کہ اس تصویر کی ایک آنکھ نے پلک جھپکائی تھی۔"

"آؤ! ابھی معلوم ہوا جاتا ہے کہ تصویر ٹھیک ہے یا نہیں۔ ہو سکتا ہے تمہارا دماغ ہی خراب ہو۔" عاقِب نے کہا۔

دونوں گیلری پر چڑھے اور قزّاق کی تصویر کو بڑی مشکل سے اوپر کھینچا۔ وہ ان کے اندازے سے کہیں زیادہ بھاری تھی۔ اس کے بعد انہوں نے ٹارچ کی روشنی

میں تصویر کو اچھی طرح دیکھا بھالا۔ اس میں کوئی انوکھی بات نہ تھی۔ جیسی عام تصویریں ہوتی ہیں، ویسی ہی تھی۔

"کمال ہے!" نسیم نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے کہا۔ "ہو سکتا ہے میری نظر نے اس وقت دھوکا کھایا ہو۔"

انہوں نے قزّاق کی تصویر وہیں ٹانگ دی اور گیلری میں سے ہوتے ہوئے محل کے ایک مینار تک پہنچ گئے۔ اس مینار کی اونچائی کوئی پچھتّر اسّی فِٹ ہو گی۔ اس میں چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں تھیں اور کھڑکیوں میں رنگین شیشے جڑے ہوئے تھے۔ وہاں سے انہیں دُور دُور کا منظر صاف دے رہا تھا۔ اُن کے اِرد گرد ویران چٹّانیں اور پہاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان پہاڑیوں کے پیچھے نگار آباد کی اُونچی اُونچی عمارتیں چھوٹے چھوٹے کھلونوں کی مانند نظر آ رہی تھیں۔

"وہ دیکھو۔" نسیم نے ایک دم چلّا کر کہا۔ وہ اُنگلی سے ایک طرف اشارہ کر رہا تھا۔ عاقِب نے اُدھر دیکھا تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ مینار سے کوئی پچاس فِٹ کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی چٹان کے نزدیک ٹیلی وژن کا انٹینا لگا ہوا تھا۔

”ٹی وی ایریل؟“ عاقِب نے حیرت سے کہا۔

”ہاں ٹی وی ایریل۔“ نسیم نے جواب دیا۔ ”غور سے دیکھ لو، کہیں یہ بھی وہم کا کرشمہ نہ ہو۔“

”ارے نہیں۔ مجھے صاف نظر آرہا ہے۔“ عاقِب نے کہا۔ ”مگر تعجّب ہے! اس ویرانے میں یہ ٹی وی ایریل کس نے لگایا ہے؟“

نسیم نے قہقہہ لگایا۔ ”ممکن ہے ضیغم خان کی روح کو ٹیلے وژن دیکھنے کا شوق ہو۔ جب بدروحیں ٹیلے فون کر سکتی ہیں اور ہمیں پاگل بڑھیا کے ذریعے دھمکی سے بھرا ہوا پیغام بھیج سکتی ہیں تو کیا ٹی وی نہیں دیکھتی ہوں گی؟“

”ہوں۔۔۔ ہوں۔۔۔“ عاقب نے کچھ سوچتے ہوئے گردن ہلائی۔ ”اس کا مطلب یہ ہے کہ اس آسیبی محل کے آس پاس کوئی ایسا شخص ضرور موجود ہے جس کے پاس ٹیلے وژن موجود ہے۔ ہمیں اب کسی وقت فرصت میں اس شخص سے بھی ملنا پڑے گا۔ خیر، آؤ اب نیچے چلیں۔ شفق کا رنگ گہرا سرخ ہوتا جارہا ہے اور سورج ڈوبنے میں شاید پندرہ منٹ باقی ہیں۔“

وہ جلدی جلدی مینار سے اُتر کر محل کے صحن میں آئے۔ صحن کے دائیں بائیں دو بڑے کمرے دکھائی دیے۔ ان میں سے ایک کمرے کے دروازے پر "لائبریری" لکھا تھا۔ نسیم نے مشورہ دیا کہ چلتے چلتے ایک نظر اس لائبریری پر بھی ڈال لیں۔ عاقِب نے اس کی بات مان لی۔ انہوں نے لائبریری میں جھانکا اور حیران رہ گئے۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ چاروں طرف فرش سے لے کہ چھت تک لکڑی کی بے شمار الماریاں رکھی تھیں اور ان میں کتابیں ہی کتابیں بھری تھیں۔ سینکڑوں نہیں، ہزاروں کتابیں لیکن سب کی سب خاک دُھول میں اٹی ہوئی۔ مکڑیوں کے جالوں کی تو کوئی گنتی ہی نہ تھی۔ یکایک ان کی نگاہ ایک گوشے میں رکھے ہوئے لکڑی کے لمبے سے صندوق پر پڑی۔ وہ اسے دیکھتے ہی پہچان گئے۔ یہ تابوت تھا۔ اس کا ڈھکنا بند تھا اور اوپر چاندی کی ایک تختی جڑی تھی۔ تختی پر یہ عبارت لکھی تھی:

"دنیا کے بہترین اداکار ضیغم خاں کی خدمت میں ایک بے نظیر تحفہ۔"

"بے نظیر تحفہ۔" نسیم نے غور سے تابوت کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے

ہمیں اسے کھول کر وہ بے نظیر تحفہ دیکھنا ہی پڑے گا۔ ذرا اس کا ڈھکنا تو کھولو۔“

”چھوڑو اسے۔ پھر کبھی دیکھیں گے۔ اندھیرا پھیلتا جا رہا ہے اور ہمیں واپس بھی جانا ہے۔“ عاقِب نے اسے سمجھایا۔ ”اس تابوت میں کوئی پرانی لاش ہو گی جسے ممی کہا جاتا ہے۔ ایسی ایسی بے شمار ممیاں قاہرہ کے عجائب خانے میں رکھی ہیں۔ آج سے کئی ہزار سال پہلے یہ فن مصریوں کے پاس تھا۔ وہ اپنے مرنے والوں کی لاشیں ایک خاص مسالا لگا کر ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا کرتے تھے۔“

”توبہ ہے تم سے بھئی۔“ نسیم نے جھلّا کر کہا۔ ”وقت بے وقت پروفیسروں کی طرح لیکچر دینے بیٹھ جاتے ہو۔ میں کہتا ہوں اس کا ڈھکنا کھولنے میں میری مدد کرو۔“ ”اور اگر میرے کہنے کے مطابق اس میں کوئی پرانی لاش نکلی، پھر؟“ عاقِب نے کہا۔

”پھر کیا؟ وہ مجھے کھا جائے گی اور تُم مزے سے تماشا دیکھنا۔“ نسیم نے جواب دیا اور تابوت کا ڈھکن کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ عاقِب نے بھی مجبوراً اس کی مدد کی۔ دونوں نے چند منٹ کی جدوجہد کے بعد آخر کار تابوت کا ڈھکنا کھول ہی لیا۔

اندر لاش کی بجائے ہڈیوں کا ایک سفید ڈھانچہ پڑا تھا۔ وہ ڈر کر پیچھے ہٹ گئے۔ انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ڈھانچا ہنس رہا ہو۔

"لعنت ہو یہ بے نظیر تحفہ بھیجنے والے پر۔" نسیم نے منہ بنا کر کہا۔ "بند کر و اسے اور ہاں، لگے ہاتھوں اس ڈھانچے کی بھی ایک تصویر کھینچ لو۔ ممکن ہے عنبر کے کسی کام آجائے۔"

"ہاں یہ بات تم نے کام کی کہی۔"

عاقِب نے جلدی سے اپنا کیمرا درست کیا اور ڈھانچے کی تصویر اُتار لی۔ اس نے لائبریری کی بھی دو تین تصویریں بنائیں اور پھر دونوں وہاں سے باہر نکلے۔ اپنے خیال کے مطابق وہ جس راستے سے آئے تھے اس راستے سے واپس ہوئے، مگر یہ دیکھ کر اُن کے ہوش اُڑ گئے کہ اس دوران میں سورج غروب ہو چکا تھا اور اندھیرے نے سارے محل پر قبضہ جما لیا تھا۔

وہ بدحواسی میں راستہ بھول کر محل کے اندرونی حصّے میں بھٹکنے لگے، اور کئی لمبی لمبی غلام گردشوں، برآمدوں اور گیلریوں میں سے ہوتے ہوئے آخر کار پھر اسی

صحن میں آ گئے جہاں سے چلے تھے۔ خوف کے مارے اُن کا بُرا حال تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو الزام دے رہے تھے۔ نسیم نے اپنی ٹارچ روشن کر رکھی تھی لیکن اتنی بھاگ دوڑ کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی بیڑی آہستہ آہستہ کم ہونے لگی اور روشنی مدھم پڑتی چلی گئی۔

"اگر ٹارچ کی بیٹری ختم ہو گئی تو سمجھو بے موت مریں گے ہم دونوں۔" عاقِب نے نسیم پر اپنا غصّہ اتارتے ہوئے کہا۔ "خواہ مخواہ تابوت کھولنے میں اتنا وقت ضائع کرا دیا۔ کتنا میں نے سمجھایا کہ پھر کبھی آئیں گے تو اسے کھول کر دیکھ لیں گے۔ لیکن تم نے وہی مرغے کی ایک ٹانگ لگائے رکھی۔"

"پھر وہی تقریر شروع کر دی تم نے۔" نسیم نے دانت پیس کر کہا۔ "پہلے اس منحوس جگہ سے باہر نکل چلو پھر جتنا جی چاہے بول لینا۔ وہ دیکھو، سامنے ایک دروازہ سا دکھائی دے رہا ہے۔ آؤ، اسے آزمائیں۔ شاید اس سے گزر کر ہم محل کے بڑے دروازے تک پہنچ سکیں۔"

دونوں لپکتے ہوئے اس دروازے تک گئے۔ ہاتھ لگاتے ہی دروازہ کھل گیا۔ ٹارچ

کی کم ہوتی ہوئی روشنی میں انہیں، ایک لمبا تہہ خانہ سا دکھائی دیا۔

وہ آگے بڑھتے گئے مگر کوئی بیس فٹ آگے جا کر پتھر کی ٹھوس دیوار ان کے آگے آگئی۔ نسیم نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا:

"آگے تو راستہ ہی بند ہے۔ واپس چلو۔ جلدی!"

وہ اُلٹے قدموں واپس ہوئے اور دروازے تک آئے، لیکن یہ دیکھ کر ان کا دل کانپ گیا کہ دروازہ بند تھا انہوں نے اسے کھولنے میں اپنے ہاتھوں اور بازوؤں کی ساری قوّت لگا دی، لیکن دروازہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ یکایک ٹارچ بجھ گئی اور وہ گھُپ اندھیرے میں کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔

"خدا رحم کرے! ٹارچ جواب دے گئی۔" اندھیرے میں نسیم کو عاقِب کی آواز سنائی دی۔ "تم کہاں ہو نسیم؟ مجھے دکھائی نہیں دے رہا۔"

"یہی حال میرا ہے۔ ایسا لگتا ہے ہم کسی قبر میں بند ہو گئے ہیں اور بس تھوڑی دیر میں مُنکر نکیر حساب کتاب لینے آتے ہی ہوں گے۔" نسیم نے جواب دیا۔

”شاباش ہے تم پر۔ اس حال میں بھی مذاق سوجھ رہا ہے تمہیں۔ ارے، خدا کو یاد کرو کہ ہم کسی طرح اس تاریک تہہ خانے سے نکلیں ورنہ یہیں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دے دیں گے۔“

”ارے باپ رے! مجھے اس کا تو خیال ہی نہیں رہا تھا۔“ نسیم نے کہا۔ ”اچھا تم جہاں ہو وہیں کھڑے رہنا۔ میں ٹٹولتا ہوا تمہارے پاس آتا ہوں۔“

ایک دو منٹ بعد نسیم کا ہاتھ عاقِب کی کھوپڑی سے ٹکرایا۔ عاقِب نے بھنّا کر اس کے دو ہتڑ رسید کیا۔ جواب میں نسیم کے ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ ”یہ تم دروازہ پیٹ رہے ہو یا مجھے مار رہے ہو؟ ایک بار پھر اپنی ٹارچ جلا کر دیکھو۔ ممکن ہے اب روشن ہو جائے۔ ذرا دو تین جھٹکے دے لینا۔ بعض اوقات اس کا بٹن ڈھیلا ہو جاتا ہے۔“

عاقِب نے پھر اپنی ٹارچ نکالی اور نسیم کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اس کو دو تین زور دار جھٹکے دیے۔ پھر اللہ کا نام لے کر اس کا بٹن دبایا۔ ٹارچ کا ننھا سا بلب آہستہ آہستہ روشن تو ہوا، لیکن پوری طرح نہیں۔ بہر حال، اتنی روشنی ضرور ہو

گئی جتنی ایک چھوٹی سی موم بتّی کی ہوتی ہے۔

"میرا خیال ہے، دوسری طرف کوئی نہ کوئی راستہ اس سُرنگ سے نکلنے کا ضرور ہو گا۔" عاقِب نے کہا "آؤ، ایک بار پھر کوشش کریں۔"

وہ دونوں دیواروں کو اچھی طرح ٹٹولتے ہوئے آگے بڑھے۔ یکایک نسیم چلّایا۔ نہ جانے اس کا ہاتھ دیوار پر کس جگہ پڑا تھا کہ ایک چھوٹا سا دروازہ آپ ہی آپ نمودار ہو گیا۔ دروازے کا رنگ بالکل دیوار جیسا تھا اور بہت غور سے دیکھنے کے بعد ہی نظر آسکتا تھا۔ نسیم نے عاقِب کا ہاتھ تھاما اور اس دروازے سے نکلا۔

اب انہوں نے اپنے آپ کو ایک اور بڑے کمرے میں پایا۔ یہاں بھی بے شمار پرانی چیزیں سجی ہوئی تھیں۔ ابھی وہ ٹارچ گھُما کر اس کمرے کا جائزہ لے ہی رہے تھے کو ان کے کانوں میں پیانو بجنے کی مدھم سی آواز آئی۔ ان کے بدن ایک دم پتھّر کے ہو گئے اور جو قدم جہاں تھا وہیں رہ گیا۔

"پیانو بج رہا ہے۔" عاقِب نے آہستہ سے کہا۔ "تم بھی سُن رہے ہو یا میرے ہی کان بج رہے ہیں؟"

”مجھے بھی آواز آ رہی ہے۔ پیانو بج رہا ہے۔“ نسیم نے اس کے کان میں کہا۔

”آؤ۔ یہاں کیوں رُک گئے؟ ذرا دیکھیں، پیانو خود بخود بج رہا ہے یا اسے کوئی بجا رہا ہے؟“

وہ دبے پاؤں آہٹ پیدا کیے بغیر آگے بڑھے۔ آہستہ آہستہ پیانو کی آواز اونچی ہوتی چلی گئی۔ اتنی اونچی کہ محل کے دروازے اور کھڑکیاں بھی تھرتھرانے لگیں۔ پورا محل پیانو کی زبردست آواز سے گونج رہا تھا۔

میوزک روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور آواز کی لہریں اسی میں سے آ رہی تھیں۔ انہوں نے ٹارچ کی روشنی اس کمرے میں ڈالی۔ قطاروں میں رکھی ہوئی کرسیاں اور صوفے دکھائی دینے لگے۔ پھر اُن کی نگاہ اس جگہ پڑی جہاں وہ بڑا سا پیانو رکھا تھا۔ پیانو کے عین اوپر، چھت اور فرش کے درمیان نیلے رنگ کا ایک شعلہ سا تھرتھرا رہا تھا۔ کبھی اس کی روشنی تیز ہو جاتی، کبھی ہلکی۔ کبھی وہ آہستہ آہستہ فضا میں تیرتا ہوا چھت کی طرف جاتا اور کبھی نیچے آنے لگتا۔ جب اس کی چمک بڑھتی تو پیانو کی آواز بلند ہو جاتی اور جب روشنی مدھم ہوتی تو آواز ہلکی ہو جاتی۔

”نیلا بھوت۔“ عاقِب نے نسیم کے کان میں کہا۔

ابھی یہ الفاظ اس نے کہے ہی تھے کہ وہ نیلا شعلہ ایک دم غائب ہو گیا، اور میوزک روم میں سے نہایت خوفناک چیخیں بُلند ہونے لگیں۔ یوں معلوم ہوا جیسے ہزاروں خُون خوار بلّیاں آپس میں لڑ رہی ہوں۔ نسیم اور عاقب کا خون خشک ہو گیا۔ وہ بے تحاشا وہاں سے بھاگے۔ نسیم آگے آگے تھا اور عاقِب پیچھے پیچھے۔ محل کا بڑا دروازہ کھُلا تھا۔ دونوں تیر کی طرح دروازے سے نکلے اور اس پگڈنڈی پر ہو لیے جو پکّی سڑک تک جاتی تھی۔ نسیم بہت آگے نکل گیا اور عاقب پیچھے رہ گیا۔

اچانک اسے اپنے پیچھے کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ شاید نیلا بھوت اس کے پیچھے آ رہا تھا۔ یہ خیال آتے ہی عاقِب نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ لیکن اندھیرے میں ایک جھاڑی سے اُلجھ کر وہ اوندھے منہ گرا۔ اس کے بدن کے نیچے خشک پتّے چرچرائے۔ پیچھے سے نیلے بھوت کے آنے کی آواز برابر آ رہی تھی۔ عاقِب نے اُٹھ کر بھاگنا چاہا لیکن اس کے ٹخنے میں بڑی بُری طرح چوٹ آئی تھی۔ کوشش کے باوجود وہ اُٹھ نہیں سکا۔ قدموں کی آواز ہر لمحے قریب آتی جا

رہی تھی۔ پھر کوئی عین اس کے پاس آن کر رُکا۔ عاقِب کا دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔
اتنے میں ایک ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا گیا۔ اُس نے پوری قوّت سے چیخ ماری۔ ”نیلے بھوت! مجھے چھوڑ دو! مجھے چھوڑ دو! میں وعدہ کرتا ہوں دوبارہ اِدھر نہ آؤں گا۔۔۔ مجھے جانے دو۔۔۔“ وہ اسی طرح چیختا چلّاتا رہا۔ پھر کسی نے اس کا بازو پکڑ کر اُٹھانے کی کوشش کی۔ خوف کے مارے اس کی آنکھیں بند تھیں اور گھگھّی بندھی ہوئی تھی۔ پھر ایک دم اس کا سر زور سے چکرایا اور وہ بے ہوش ہو گیا۔

آئینے میں کون؟

اُس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ نہ جانے وہ کتنی دیر سے بے ہوش پڑا تھا۔ بے ہوش ہونے سے پہلے کسی کے قہقہوں کی آواز اس کے کان میں آئی تھی اور پھر کسی نے گرج دار لہجے میں کہا تھا۔ ”ہر گز۔۔۔ اے نادان اور احمق لڑکے، اب تُو ہمارے قابو میں ہے۔۔۔ ہم نے تجھے اور تیرے بے وقوف ساتھیوں کو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ اگر تم نے اپنی بے ہودہ حرکتیں نہ چھوڑیں تو ہم تمھیں خوف ناک سزا دیں گے لیکن تُم لوگ نہ مانے۔ ہاہاہا۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔“

عاقِب نے اب پوری طرح آنکھیں کھول دی تھیں۔ سامنے عنبر اور نسیم کرسیوں پر بیٹھے قہقہے لگا رہے تھے۔ وہ ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

"کیا وہ کوئی بھیانک خواب تھا؟" اس نے پاگلوں کی طرح پلکیں جھپکا کر پوچھا۔ "اگر وہ خواب نہیں تھا تو پھر مجھے یہاں کون لایا؟ کیا نیلے بھوت نے مجھے پکڑا نہیں تھا؟"

"ارے نہیں یار ہوش کی بات کرو۔" نسیم نے ہنس کر کہا۔ "جسے تم نیلا بھوت سمجھے تھے وہ تو میں تھا۔ جب میں نے دیکھا کہ تم بہت پیچھے رہ گئے ہو تو میں واپس آیا۔ دیکھا کہ تم جھاڑیوں کے پاس گر پڑے ہو۔ میرے قدموں کی آہٹ سنتے ہی تم چیخنے چلّانے اور رونے لگے کہ نیلے بھوت مجھے مت پکڑو۔۔۔ میں وعدہ کرتا ہوں دوبارہ اِدھر نہ آؤں گا۔۔۔ مجھے جانے دو۔۔۔ میں نے تمہارے کندھے پر تسلّی دینے کے لیے ہاتھ رکھا ہی تھا کہ تم ایک ہول ناک چیخ مار کر بے ہوش ہو گئے۔ اتنے میں اللہ داد اور عنبر جو پہلے ہی سے ہمیں ڈھونڈنے اِدھر آرہے تھے وہاں پہنچ گئے۔ پھر ہم نے تمھیں ڈنڈا ڈولی کر کے اٹھایا، کار میں ڈالا اور یہاں لے

آئے۔ اب تم ہیڈ کوارٹر میں ہو۔"

عاقِب نے شرمندہ ہو کر گردن جھکالی۔ عنبر نے کہا۔"اس میں شرمندہ ہونے کی کیا بات ہے۔ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو اس کی کیفیّت بھی اسی قسم کی ہوتی۔ بہر حال تم دونوں کے وہاں جانے سے بعض باتوں کی تصدیق ہو گئی ہے۔ یعنی یہ کہ پیانو واقعی خود بخود بجتا ہے۔ میوزک روم میں نیلے رنگ کا ایک چمک دار شعلہ سا بھی تمہیں دکھائی دیا جو چھت اور فرش کے درمیان فضا میں کبھی اوپر آتا کبھی نیچے جاتا تھا۔ یہ ایک عجیب و غریب دریافت ہے۔ غالباً اسی کو لوگوں نے نیلے بھوت کا نام دے رکھا ہے۔ خیر، اب تم اسی بستر پر لیٹ کر ایک آدھ گھنٹا آرام کر لو۔ خالہ جان چائے لے کر آرہی ہیں وہ پی لینا۔ میں اتنی دیر میں وہ تصویریں جو تم نے بھُوت محل میں کھینچی ہیں تیّار کر لوں۔"

عنبر یہ کہہ کر ڈارک روم کی طرف بڑھ گیا۔ اسے فوٹو گرافی کا بھی شوق تھا اور فلمیں دھونے کے لیے اس نے اپنے ہیڈ کوارٹر ہی میں ڈارک روم بنا رکھا تھا۔ یہیں وہ تصویروں کے پرنٹ بھی نکال لیتا تھا اور ضرورت پڑتی تو تصویر کو انلارج

یعنی بڑا بھی کر لیا۔

خالہ جان چائے کے ساتھ بیسن کا گرم گرم حلوا بھی لائیں۔ چائے پینے اور حلوا کھانے کے بعد عاقِب کے ہوش و حواس کسی قدر ٹھیک ہوئے۔

نسیم نے کہا۔ ”میں تھوڑی دیر کے لیے گھر جا رہا ہوں۔ اتنے میں تم سو جاؤ۔ ساری تھکن دور ہو جائے گی۔ عنبر اس دوران میں میرے بارے میں پوچھے تو کہہ دینا ابھی آتا ہوں۔“ عاقِب دیر تک سوتا رہا۔ کوئی آٹھ بجے کے قریب اس کی آنکھ کھلی۔ دیکھا کہ عنبر ہاتھ میں محدّب شیشہ لیے وہی تصویریں غور سے دیکھ رہا ہے جو اس نے آسیبی محل میں اتاری تھیں۔ اس کو اٹھتے دیکھ کر عنبر نے کہا:

”تم نے بہت اچھی تصویریں اتاری ہیں۔ کاش ہمّت کر کے نیلے بھُوت کی بھی ایک تصویر اتار لیتے۔“

”خواہ تمہارا ڈر کے مارے وہاں دم ہی نکل جاتا۔“ نسیم نے اندر آتے ہوئے کہا۔ اس نے عنبر کی یہ بات سن لی تھی۔ پھر وہ عنبر کی طرف منہ کر کے کہنے لگا:

”یہاں بیٹھ کر باتیں بنانا بہت آسان ہے اور آسیبی محل میں جا کر نیلے بھوت کی تصویر بنانا بہت مشکل۔ ہم تو جب جانیں کہ تم وہاں جاؤ اور نیلے بھوت کی تصویر اتارو۔“

”ٹھیک ہے۔ یہ کام میں کروں گا۔“ عنبر نے سنجیدگی سے کہا اور اپنی عادت کے مطابق نچلا ہونٹ ناخن سے کاٹنے لگا۔

چند لمحے بعد اس نے اپنی پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر چاک کے تین لمبے لمبے ٹکڑے نکالے۔ اس نے ایک چاک عاقِب کو دیا، ایک نسیم کو۔ انہوں نے حیرت سے چاک کو دیکھا اور پوچھا۔ ”یہ تحفہ کس لیے عطا ہوا ہے ہمیں؟“

”یہ بہت کام کی چیز ہے۔ اسے سنبھال کر رکھو۔ ممکن ہے اس مہم میں ہم میں سے کوئی کسی آفت میں پھنس جائے۔ دوسروں کو اپنا نشان بتانے کے لیے اس چاک کا استعمال ضروری ہے۔ عاقِب، تمہارے چاک کا رنگ سبز ہے اور نسیم کے چاک کا رنگ نیلا۔ میرے پاس سفید چاک ہے۔ جب ہم میں سے کوئی خطرے میں پھنس جائے تو اسے چاہیے کہ وہ اپنے چاک سے جہاں بھی موقع ملے، ویسا ہی سوالیہ

نشان بنا دے جیسا ہمارے ملاقاتی کارڈوں پر چھپا ہوا ہے۔ اُمّید ہے تم دونوں میری بات سمجھ گئے ہو گے۔ ان نشانوں کو دیکھ کر ہم ایک دوسرے کا سراغ لگا سکیں گے۔ یہ سوالیہ نشان (؟) جہاں بھی نظر آ جائے، فوراً سمجھ لیا جائے کہ ہم میں کوئی ایک اس جگہ سے گزرا ہے۔ سفید نشان میری موجودگی کا پتا دے گا۔ سبز نشان عاقِب کی بابت اور نیلا نشان نسیم کے بارے میں بتائے گا۔ اگر میں پہلے یہ تدبیر کر لیتا تو تم دونوں آسیبی محل میں راستہ نہ بھولتے۔"

"چلو صبح کا بھولا شام کو گھر آ جائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔" نسیم نے کہا۔

عنبر مُسکرایا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "چاک سے کسی دیوار یا مکان کے دروازے پر بنایا ہوا سوالیہ نشان دوسروں کے لیے کسی حیرت یا دلچسپی کا باعث نہیں بنے گا۔ جو بھی اسے دیکھے گا، یہی خیال کرے گا کہ کسی بچّے نے بنایا ہے۔ لیکن ہم تینوں کے لیے یہی سوالیہ نشان ایک پیغام ہو گا۔ لہٰذا تم دونوں ہر وقت اپنا اپنا چاک جیب میں رکھو۔"

"یس سر۔" نسیم نے کھڑے ہو کر فوجیوں کی طرح زوردار سیلوٹ مارتے ہوئے

کہا۔ اُس کی اس حرکت پر عاقِب اور عنبر دونوں کھکھلا کر ہنس پڑے۔ عنبر نے کہا:

”اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اس بھیانک راز سے پردہ اٹھائیں، جو مدّتوں سے آسیبی محل پر پڑا ہوا ہے۔ میں غور و فکر کے بعد چند ایسی باتیں معلوم کر چکا ہوں جو کبھی غلط ثابت نہیں ہو سکتیں۔ عاقِب، تم آج رات یہیں رہو گے۔ میں تمھارے گھر فون کیے دیتا ہوں۔ اور نسیم، تم تو اپنے والدین سے ایک رات اور غیر حاضر رہنے کی اجازت لے کر آئے ہو گے۔ میں نے اللہ داد ڈرائیور کو رات کے ٹھیک گیارہ بجے طلب کیا ہے۔ وہ کار لے کر آ جائے اور انشاء اللہ ہم پورے بارہ بجے آسیبی محل کے اندر ہوں گے۔“

عنبر کی یہ بات سُن کر عاقِب اور نسیم حیرت میں رہ گئے۔ دیر تک ایک لفظ بھی ان کے منہ سے نہ نکل سکا۔ آخر عاقِب نے کچھ ہچکچاتے ہوئے کہا۔

”تم مجھے چھٹی نہیں دے سکتے؟ میرے خیال میں نسیم کو اپنے ساتھ محل کے اندر لے جاؤ، میں باہر کار میں اللہ داد کے ساتھ بیٹھ کر تمھارا انتظار کروں گا۔“

”جی ہاں، ایک میں ہی سب کو پتلی گردن والا دکھائی ہوں نا۔“ نسیم نے منہ بنا کر کہا۔ ”کیا مزے سے کہا کہ نسیم کو اپنے ساتھ محل کے اندر لے جانا، اور میں کار میں بیٹھ کر انتظار کروں گا۔ ہرگز نہیں، اگر میں محل کے اندر جاؤں گا تو تمہیں بھی چلنا پڑے گا۔“

”ٹھہرو ٹھہرو۔“ عنبر نے ہاتھ اُٹھا کر کہا۔ ”لڑائی جھگڑے کوئی فائدہ نہیں۔ میرا خیال ہے، عاقِب کی بات میں کچھ وزن ہے۔ فرض کرو ہم تینوں محل میں گئے اور کسی مصیبت میں پھنس گئے تب کیا ہو گا؟ سوائے اللہ داد کے کسی کو بھی معلوم نہ ہو گا کہ ہم کہاں ہیں اور وہ بے چارہ کیا کرے گا؟ اتنی قیمتی کار کو چھوڑ کر وہ ہماری تلاش میں نہیں نکل سکے گا۔ عاقِب کا کہنا درست ہے۔ وہ محل کے باہر رہے گا تاکہ ضرورت پڑنے پر ہمیں تلاش کر سکے۔ ہم اس دوران میں جہاں جہاں جائیں گے وہاں چاک سے سوالیہ نشان بناتے رہیں گے تاکہ تمہیں ڈھونڈنے میں عاقِب کو کسی دقّت کا سامنا نہ ہو۔“

جب گھڑیال نے زور دار آواز میں رات کے گیارہ بجنے کا اعلان کیا تو عین اسی لمحے

باہر سے کار کا ہارن بجنے کی آواز آئی۔ تینوں لڑکے دبے پاؤں اپنے ہیڈ کوارٹر سے نکلے۔ ان کے پاس ٹارچیں، کیمرا اور ٹیپ ریکارڈر بھی موجود تھا۔ اللہ داد نے فوراً کار کا دروازہ کھولا اور تینوں اپنی اپنی جگہ آرام سے بیٹھ گئے۔ اللہ داد نے نگار آباد کی طرف جانے والی سڑک پر کار پوری رفتار سے چھوڑ دی۔

رات تاریک اور ڈراؤنی تھی۔ آسمان پر بادل جمع ہو رہے تھے اور دُور مغرب کی جانب بجلی بار بار چمک رہی تھی۔۔۔ ایسا لگتا تھا کہ آج رات بارش ضرور ہو گی۔ شہر سے باہر نکلتے ہی تاریکی اور بڑھ گئی۔ سب چُپ چاپ بیٹھے اس انوکھے سفر کا لطف اٹھا رہے تھے۔ بہت جلد کار پہاڑی سڑک پر آ گئی اور موڑ تیزی سے آنے لگے۔ ہر موڑ پر کار کے ٹائروں سے ایسی آواز آتی جیسے وہ فریاد کر رہے ہوں کہ آہستہ چلو، آہستہ چلو۔ لیکن ڈرائیور بڑا ماہر تھا اور کار اس ہاتھوں کے اشارے پر چل رہی تھی۔

مقرّرہ جگہ پہنچ کر اللہ داد نے کار روک لی اور بڑی بتّیاں بجھا دیں۔ چھوٹی بتّیاں جلتی رہنے دیں۔ عنبر اور نسیم کار سے اُترے اور آگے پیچھے چلتے ہوئے اندھیرے

میں گُم ہو گئے۔ ہوا کے جھونکے تیز ہوتے جا رہے تھے اور چٹانوں کے اندر سے کسی کے سسکیاں لے لے کر رونے کی آواز آ رہی تھی۔ نسیم نے چونک کر کہا:

"کوئی عورت رو رہی ہے۔" "تم نے اس کی آواز نہیں سُنی؟" عنبر نے جواب دیا۔ "یہ کسی عورت کے رونے کی آواز نہیں۔ ہوا چٹانوں کے اندر سے فرّاٹے بھرتی ہوئی نکلتی ہے تو ایسی آواز میں پیدا ہوتی ہیں۔ ان پر دھیان مت دو اور خاموشی سے آگے چلتے جاؤ۔ کوشش کرو کہ تمہارے قدموں کی آہٹ نہ ہونے پائے۔ اگرچہ ہم دونوں نے ربڑ کے جوتے پہن رکھے ہیں پھر بھی احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ پھونک پھونک کر قدم رکھیں؟"

"سبحان اللہ۔" نسیم نے کہا۔ "جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی۔ اب مجھ میں اتنی ہمّت تو ہے نہیں کہ پہلے پھُونک ماروں اور پھر قدم آگے رکھوں، نہ میں ایسا پاگل ہوں۔" "اُفّوہ، بھئی، میں نے تو محاورہ استعمال کیا تھا۔" عنبر نے کہا۔ "اور تم بات کو کہیں سے کہیں لے گئے۔ اچھّا، اب بولو مت۔ بالکل خاموش رہو۔ ہم نہیں چاہتے کہ کسی کو ہماری آمد کا ذرا بھی پتا چلے۔"

”لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟“ نسیم نے حیرت سے پوچھا۔ ”کیا بد روحوں کو بھی ہمارے آنے کا پتا نہیں چل سکتا؟“

”ہاں، نہیں چل سکتا۔“ عنبر نے اسے ڈانٹا۔

نسیم منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا کر خاموش ہو گیا۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے وہ دونوں آسیبی محل کے دروازے تک جا پہنچے۔ محل کی اُونچی اُونچی گول بُرجیاں کالے دیوؤں کی مانند سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ سارا ماحول اتنا ڈراؤنا اور بھیانک تھا کہ اچھے خاصے بہادر آدمی کا پِتّا بھی پانی ہو جائے۔ انہوں نے ابھی دروازے کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھا ہی تھا کہ ایک ہول ناک چیخ فضا میں گونجی۔ نسیم کا دل کانپ گیا، اور اس نے بڑھ کر عنبر کا بازو تھام لیا۔ عنبر نے اس کے کان میں کہا۔

”ڈرو مت۔ یہ گیدڑ کی چیخ ہے۔ راتوں کو گیدڑ اسی طرح چلایا کرتے ہیں۔ بس چپ چاپ میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔ جب میں کہوں، ٹارچ جلانا، اور خبر دار! بولنا مت۔“ ہال کمرے میں گھُپ اندھیرا تھا اور ایسا سنّاٹا کہ وہ ایک دوسرے کے سانسوں کی آواز بھی اچھی طرح سُن رہے تھے۔ اچانک ہال کا دروازہ ایک

دھماکے سے آپ ہی آپ بند ہو گیا۔

"ٹارچ روشن کرو، فوراً۔" عنبر نے کہا اور نسیم نے اسی وقت ٹارچ کا بٹن دبا دیا۔ ہال کمرے میں تیز روشنی پھیل گئی۔ دروازہ واقعی بند ہو چکا تھا۔ وہ دونوں دروازے کے قریب گئے اور اسے کھولنے کے لیے ہینڈل پر ہاتھ ڈالا، لیکن دروازہ کوشش کے باوجود نہ کھُلا۔ البتّہ اس زور آزمائی میں ہینڈل اُکھڑ کر اُن کے ہاتھ میں آ گیا۔

ابھی وہ ہینڈل کو غور سے دیکھ ہی رہے تھے کہ دوسری جانب سے دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ انہوں نے پلٹ کر دیکھا۔ تصویروں والے چھوٹے کمرے میں کھلنے والا دروازہ بھی خود بخود بند ہو گیا تھا۔ خوف کے مارے نسیم کی حالت بگڑنے لگی۔ لیکن عنبر کے ہوش صحیح سلامت تھے۔ اس نے اونچی آواز میں پکار کر کہا:

"اے ضیغم خاں کی روح، ہم تجھے کوئی نقصان پہچانا نہیں چاہتے۔ بلکہ تیرے سکون اور آرام کے لیے یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ ہمیں ستانے سے تجھے کیا ملے

گا؟ دروازہ کھول دے۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو عنبر؟ پاگل تو نہیں ہو گئے؟" نسیم نے اسے جھنجھوڑ کر پوچھا۔ اس کا خیال تھا خوف سے عنبر کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ لیکن ابھی عنبر جواب بھی نہ دینے پایا تھا کہ ہال کمرے کی ایک دیوار شق ہوئی اور ایک چھوٹا سا خفیہ دروازہ دکھائی دیا۔ عنبر نے دروازے کی طرف قدم بڑھایا کہ نسیم نے جلدی سے اس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور کہا:

"اُدھر مت جاؤ۔ خدا جانے وہاں کیا ہو گا؟"

"وہاں کچھ بھی نہیں ہے پیارے بھائی۔" عنبر نے اطمینان سے کہا۔ "بے فکر ہو کر میرے ساتھ آؤ۔ آج اس آسیبی محل کے تمام رازوں سے پردہ اُٹھنے والا ہے۔"

وہ خفیہ دروازے میں داخل ہوئے تو انہوں نے اپنے آپ کو ایک ایسے کمرے میں پایا جس کے درمیان میں ایک لمبی میز بچھی تھی۔ میز کے اِرد گرد بارہ کرسیاں دھری تھیں۔ میز پر خوب صورت چینی کے برتنوں میں طرح طرح کے لذیذ

کھانے تھے، اور تعجّب کی بات یہ تھی کہ ان کھانوں میں سے بھاپ اُٹھ رہی تھی۔ تازہ پھلوں سے بھری ہوئی دو ٹوکریاں بھی میز پر رکھی تھیں۔ "کیا میں کوئی سہانا خواب دیکھ رہا ہوں؟" نسیم نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔

"خواب نہیں یہ حقیقت ہے۔" عنبر نے جواب دیا۔ "اس وقت ہم ضیغم خاں کے مہمان ہیں۔ اس نے سوچا ہو گا کہ یہ بے چارے آدھی رات کو آئے ہیں۔ بھوکے ہوں گے۔ انہیں کچھ کھلا پلا دو۔ میرا خیال ہے ہم یہ کھانا تھوڑا بہت چکھ لیں، ورنہ ہمارے میزبان کا دل ٹوٹ جائے گا۔"

نسیم نے اسے روکا اور سمجھایا کہ ممکن ہے ان کھانوں میں زہر ملا دیا گیا ہو تا کہ ہم اسے کھاتے ہی دوسری دنیا کو روانہ ہو جائیں۔ لیکن عنبر نے اس کی ایک نہ سُنی اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کی دیکھا دیکھی نسیم کو بھی کھانے میں شریک ہونا پڑا۔ کھانا بے حد لذیذ تھا۔ انہوں نے خوب بڑھ بڑھ کر ہاتھ مارے۔ نسیم نے کہا:

"اگر ایسی دعوت روز ہوا کرے تو خدا کی قسم میں ہمیشہ اس آسیبی محل میں رہنے کو تیّار ہوں۔"

”ٹھیک ہے، میں تمہیں یہیں چھوڑ جاؤں گا۔“ عنبر نے پلاؤ کھاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے امید ہے ضیغم خاں کی روح تمہارا بہت خیال رکھے گی۔“

”عا۔۔۔ آ۔۔۔۔۔ عا۔۔۔۔۔۔ عاہاہا۔۔ آ۔“ نسیم کے حلق سے عجیب طرح کی بھیانک آواز ایک دم نکلی۔ عنبر نے چونک کر دیکھا۔ اس کی آنکھیں اُبلی پڑ رہی تھیں۔ اور خوف سے اس کے چہرے کا رنگ ہلدی کی طرح پیدا پڑ گیا تھا۔ پھر اُس نے انگلی سے عنبر کی پیٹھ کی جانب اشارہ کیا۔ عنبر نے فوراً مڑ کر دیکھا اور ایک لمحے کے لیے اس کے دل کی حرکت بھی بند ہو گئی اور نوالہ ہاتھ سے گر گیا۔ عنبر کے پیچھے والی دیوار میں آدمی کے قد کے برابر ایک آئینہ لکڑی کے چوکور فریم میں جڑا ہوا لٹک رہا تھا۔ اس آئینے میں انہیں ایک لمبی تڑنگی عورت کا عکس نظر آ رہا تھا۔ عورت نے گردن سے لے کر ٹخنوں تک سیاہ رنگ کا لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے اور آنکھوں میں ستاروں کی سی چمک تھی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ سیاہ لباس کے اندر چھپا رکھے تھے اور پلک جھپکے بغیر نسیم اور عنبر کو گھور رہی تھی۔

چند لمحوں تک دونوں لڑکے جنبش کیے بغیر اسے تکتے رہے۔ ان کے بولنے اور سوچنے سمجھنے کی تمام قوّتیں جواب دے چکی تھیں۔ عورت کا عکس ایک زندہ لاش کی مانند صاف شفاف آئینے کے اندر دکھائی دے رہا تھا۔ وہ نہ حرکت کرتی تھی۔ نہ بولتی تھی۔ اس کے سانس لینے کی آواز بھی سنائی نہ دیتی تھی۔

"یہ یقیناً کوئی بدروح ہے۔؛ نسیم نے چُپکے سے کہا۔ "ذرا دیکھو تو ہمیں کیسے گھور رہی ہے۔"

"اس پر ٹارچ کی روشنی ڈالو۔" عنبر نے کہا۔ نسیم نے فوراً ٹارچ کی روشنی آئینے پر ڈالی۔ پلک جھپکنے میں عورت غائب ہو گئی۔ اب وہاں آئینہ خالی پڑا تھا۔ وہ دونوں گھور گھور کر آئینے میں دیکھ رہے تھے۔ لیکن اب انہی کا عکس آئینے میں دکھائی دے تھا۔ انہوں نے آئینے کے چاروں طرف روشنی ڈالی، اسے اچھی طرح دیکھا بھالا، مگر بے سود۔ اس میں اتنا سوراخ بھی نہ تھا کہ ایک چیونٹی بھی داخل ہو سکتی۔

عنبر نے سوچتے ہوئے کہا۔ "بے شک ہم دونوں نے اس آئینے میں ایک عورت

کا عکس دیکھا، لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ہمارا وہم ہو۔ کبھی کبھی اس قسم کے حیرت انگیز کرشمے انسان اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے، مگر اصل میں ان کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ ان کی حیثیت صرف نظر کے فریب کی سی ہوتی ہے۔"

"خیر، خیر۔ یہ تمھارا خیال ہے، میرا نہیں۔" نسیم نے جواب دیا۔ "میں اسے آئینے کی چڑیل یا بد روح ہی کہوں گا۔ تمہاری آنکھیں تمہیں دھوکا دیتی ہوں گی، میری آنکھیں مجھے دھوکا نہیں دیتی۔ بہر حال، یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہاں ایک نہیں بے شمار بد روحیں موجود ہیں۔ اب تم ہی بتاؤ کہ اس سُنسان اور ویران محل میں یہ تازہ گرما گرم لذیذ کھانے کہاں سے آئے؟ کیا یہ بھی نظر کا فریب ہے؟"

"نہیں۔ یہ اور معاملہ ہے۔ مجھے یقین ہو چلا ہے کہ بد روحوں اور بھوتوں کا ڈھونگ رچایا جا رہا ہے اور اس کا مقصد صرف لوگوں کو خوف زدہ کر کے محل سے دور رکھنا ہے۔ میں پختہ ارادہ کر چکا ہوں کہ اس راز سے پردہ اُٹھا کر ہی چھوڑوں گا۔"

"تم بے شک پردہ اٹھاؤ یا گراؤ، لیکن خدا کے واسطے مجھے جانے دو۔ میں بھوتوں

سے جنگ کرنے کی ہمّت نہیں رکھتا۔ یہ خبط تم ہی کو مبارک ہو۔"

یہ کہہ کر نسیم نے جانے کے لیے قدم بڑھایا۔ عین اسی لمحے عنبر کا ہاتھ آئینے کے فریم پر نہ جانے کس جگہ لگا کہ وہ کھٹاک سے ایک دروازے کی طرح کھل گیا اور فریم کے پیچھے دیوار میں ایک تنگ سا راستہ دکھائی دینے لگا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف حیران نظروں سے دیکھا۔ بے اختیار نسیم نے کہا:

"ارے! یہ کیا"!

"بس دیکھتے جاؤ، کیا ہوتا ہے۔" عنبر نے جواب دیا۔ "تم سے بڑی حماقت یہ ہوئی کہ اس عورت کی تصویر نہیں لے سکے۔ آیندہ ایسی غلطی نہ ہونے پائے۔ اپنے حواس قائم رکھو۔ ابھی نیلے بھوت کی تصویر بھی اُتارنی ہے۔"

"بھوتوں اور بدروحوں کی تصویریں کیمرا نہیں اتارا کرتا۔" نسیم نے جھلّا کر کہا۔ "میں نے اسی لیے اس عورت کی تصویر نہیں اُتاری، ورنہ میرے ہوش و حواس سب ٹھیک تھے۔"

”اور وہ عاعاعا۔۔۔ کون کر رہا تھا۔“ عنبر نے مُسکرا کر پوچھا۔ ”خوف سے گھگھّی کس کی بندھی ہوئی تھی؟ بہر حال، یہ اچھی طرح یاد رکھو کہ کیمرا بھوتوں اور بدروحوں کی تصویریں نہیں لے سکتا تو بدروحیں آئینے کے اندر بھی نظر نہیں آیا کرتیں۔ سمجھے؟“

”سمجھ گیا۔ اب یہیں بحث کیے جاؤ گے یا آگے بھی چلو گے؟“ نسیم نے منہ بنا کر کہا۔ ”لیکن اس پتلی سرنگ میں گھسنے سے پہلے چاک سے اس آئینے کے اوپر سوالیہ نشان تو بناتے جاؤ۔ ممکن ہے ہم کسی آفت میں پھنس جائیں اور عاقِب ہمیں ڈھونڈنے آئے۔“

”ہاں، یہ بات تم نے عقل مندی کی کہی۔ عنبر نے کہا۔ ”چاک سے سوالیہ نشان بنانا تو میں بھول ہی گیا تھا۔“

”کبھی تم نے اس بات پر بھی غور کیا ہے کہ اگر میں تمہارے ساتھ نہ ہوں تو تمہارا کیا حشر ہو۔“ نسیم نے اکڑ کر کہا۔

عنبر نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ جانتا تھا کہ نسیم کی عادت ہی مذاق

کرنے کی ہے۔ اس نے چاک سے پہلے میز پر ایک بڑا سا سوالیہ نشان بنایا، پھر باہر نکل کر اس چھوٹے سے خفیہ دروازے پر جس کے ذریعے یہ اس کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ اس کے بعد آئینے کے درمیان میں۔

انہوں نے آگے پیچھے سُرنگ میں قدم رکھا اور دونوں ٹارچیں روشن کر دیں۔ نسیم نے ہولے سے کہا:

"خدا کی پناہ! سُرنگ ہے یا کسی کی تاریک قبر! اور یہاں ٹھنڈ کتنی ہے۔"

عنبر نے پلٹ کر آئینے کے فریم والا چھوٹا سا دروازہ بند کر دیا اور بولا۔ "معلوم ہوتا ہے اس کے اندر کوئی خفیہ کمانی یا کھٹکا ایسا لگا ہوا ہے جس کی مدد سے اسے کھولا یا بند کیا جا سکتا ہے۔"

اُس نے پھر اندرونی فریم پر ہاتھ کا دباؤ ڈال کر اسے کھولنا چاہا لیکن کوشش کے باوجود آئینہ اپنی جگہ سے نہ ہٹا۔

نسیم نے گھبرا کر کہا۔ "غضب ہو گیا! اگر یہ خفیہ دروازہ نہ کھُلا تو ہم اس سرنگ میں

قید ہو کر رہ جائیں گے۔"

بھوتوں کی قید میں

عنبر نے مُڑ کر سرنگ کے پہلے سِرے تک دیکھنے کی کوشش کی، مگر سُرنگ بہت لمبی تھی اور ٹارچ کی روشنی وہاں تک پہنچ نہیں رہی تھی۔ اس کے باوجود عنبر کے حوصلے میں کوئی فرق نہ آیا۔ اس نے کہا:

"گھبراؤ مت۔ جس طرح اس سرنگ میں داخل ہونے کا خفیہ راستہ ہے، اسی طرح باہر نکلنے کا بھی کوئی نہ کوئی راستہ ضرور ہو گا۔ آؤ، ذرا آگے چل کر دیکھیں۔"

عنبر نے اپنی ٹارچ بجھا دی اور نسیم کی ٹارچ چلتی رہنے دی۔ دونوں ٹارچیں ایک ہی وقت میں روشن کرنے سے کوئی فائدہ نہ تھا۔ سُرنگ کی لمبائی کوئی پچاس فٹ ہو گی۔ دونوں طرف پتھروں کی دیوار تھی۔ اس میں کوئی روزن تھا نہ روشن دان۔ اس کے باوجود وہاں گھٹن اور حبس کا کوئی اثر نہ تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ تازہ ہوا کے لیے اس دیوار میں کوئی سوراخ ضرور بنایا گیا ہے۔ عنبر نے جا بجا دیوار تھپتھپانی شروع کر دی۔ ایک جگہ وہ رُکا اور دیوار پر آہستہ آہستہ تین مرتبہ ہاتھ مارنے کے بعد کہنے لگا:

”سنو، یہاں دیوار ٹھوس نہیں۔ اندر سے کھوکھلی معلوم ہوتی ہے۔ آواز صاف بتا رہی ہے۔“

نسیم نے بھی ہاتھ مار کر آواز سنی اور اقرار کیا کہ وہاں دیوار کھوکھلی ہے۔ عین اسی لمحے پیانو بجنے کی مدھم سی آواز ان کے کانوں میں آئی۔ وہ دونوں اچھل پڑے۔ البتّہ آہستہ آہستہ پیانو کی آواز اونچی اور تیز ہوتی جا رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی اس لمبی سرنگ کے پرلے سِرے پر بیٹھا پیانو بجا رہا ہے۔ دو تین منٹ تک

دونوں اپنی جگہ چُپ چاپ کھڑے یہ پراسرار آواز سنتے رہے۔ پھر عنبر نے کہا:

”معلوم ہوتا ہے ان دیواروں میں کہیں نہ کہیں چھوٹے چھوٹے سپیکر چھپائے گئے ہیں ورنہ ان دیواروں میں سے آواز آنے کا مقصد کیا ہے؟“

یہ کہتے ہی اس نے ایک دیوار سے کان لگا دیے۔ آواز بے شک دیوار میں سے آ رہی تھی۔ نسیم نے بھی کان لگائے۔ ایسا لگا جیسے دیوار کے پرلی طرف چھوٹا سا سپیکر لگا ہوا ہو۔ ویسا ہی سپیکر جیسا چھوٹے چھوٹے ٹرانسسٹروں اور ریڈیو میں لگا ہوتا ہے۔

”اس آسیبی محل کے بھوت شاید ریڈیو مکینک بھی ہیں۔“ نسیم نے کہا۔ ”واقعی کم بختوں نے دیوار میں سپیکر فٹ کر رکھے ہیں، لیکن میں حیران ہوں کہ یہ چکّر کیا ہے“!

”بس یہ حیرانی تھوڑی دیر کی اور ہے۔ اس کے بعد ہم انشاء اللہ اس چکر سے نکل جائیں گے۔ ابھی ہمیں میوزک روم میں پہنچ کر پیانو بجانے والے نیلے بھوت کا انٹرویو بھی لینا ہے۔“ عنبر نے کہا:

”اور اگر اس نے ہمیں پکڑ لیا تو؟“ نسیم نے پوچھا۔

”اوہو! پھر وہی بات۔ اب تک نیلے بھُوت کے بارے میں ہم نے نہیں سنا کہ اس نے کبھی کسی کو نقصان پہنچایا ہو۔“

وہ یہ بات کر رہے تھے کہ سُرنگ کے اندر ایک عجیب تبدیلی نمودار ہونے لگی۔ نسیم نے ہکلا کر عنبر کی توجّہ اس طرف کرائی:

”وہ۔۔۔وہ۔۔۔د۔۔۔دیکھو۔۔۔ک۔۔۔کیا ہے؟“

عنبر نے پلٹ کر دیکھا۔ سُرنگ کے اندر گاڑھا گاڑھا چمکتا ہوا سُرمئی رنگ کا دھواں سا اُٹھ رہا تھا۔ اور اس میں سے جلے ہوئے گوشت اور ہڈّیوں کی بُو آ رہی تھی۔ ٹارچ کی روشنی جب اس دھوئیں پر پڑتی تو اس کے اندر عجیب عجیب شکلیں اور صورتیں دکھائی دیتی۔

”مُردے کا ڈھانچہ!“ نسیم چلّایا۔ ”بھاگو، وہ ہمیں پکڑنے کے لیے آ رہا ہے۔۔۔ ارے۔۔۔ وہ تو غائب ہو گیا۔۔۔ اب اس کی جگہ ایک خوف ناک شیر نے لے

لی ہے۔ دیکھو دیکھو، شیر ایک دم گیڈر بن گیا۔۔۔“

عنبر کو بھی طرح طرح ڈراؤنی شکلیں اس دھوئیں میں بنتی اور بگڑتی دکھائی دے رہی تھیں۔ شروع میں اس پر بھی یہ شکلیں دیکھ کر ہیبت سی طاری ہوئی لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے یہ خیال اپنے ذہن سے جھٹک دیا اور نسیم کہنے لگا۔ ”ان شکلوں پر دھیان نہ دو۔ یہ محض خیالی ہیں۔ ان کا کوئی وجود نہیں۔ تم نے ضیغم خاں کی لائبریری میں مُردے کا جو ڈھانچہ دیکھا تھا اسی کو تمھارے خیال نے آنکھوں کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ کبھی تم نے بادلوں کو دیکھا ہے؟ آسمان پر ان کی کیسی عجیب عجیب شکلیں بنتی اور بگڑتی نظر آتی ہیں۔ حال آں کہ وہ سب ہمارے ہی ذہن کی پیداوار ہوتی ہیں۔ نیلا بھوت دراصل ہمیں ڈرانے کے لیے یہ حرکتیں کر رہا ہے اور وہ نیلا بھُوت سوائے ضیغم خاں کے اور کوئی نہیں۔“ نسیم اُچھل پڑا۔ ”کیا کہا تم نے؟ نیلا بھوت ہی ضیغم خاں ہے یا ضیغم خاں نیلا بھوت؟“

”اس میں نہ سمجھنے والی بات کیا ہے!“ عنبر نے کہا۔ ”شروع ہی سے میرا خیال تھا کہ ضیغم خاں نے کسی خاص مقصد کے لیے اپنے محل کو آسیبی مشہور کیا ہے، ورنہ

یہاں کوئی بھُوت پریت سِرے سے ہی نہیں۔"

"لیکن ضیغم خاں تو کبھی کا مر چکا ہے؟" نسیم کی حیرت بڑھتی جارہی تھی۔ "کیا تمہیں یاد نہیں رہا کہ اس نے اپنی کار پہاڑی سے سمندر میں گرادی تھی؟"

"ہاں۔ وہ واقعہ بھی ہوا تھا۔ لیکن یہ اس بات کا ثبوت نہیں کہ اس کار میں ضیغم خاں ہی سوار تھا۔" عنبر نے جواب دیا۔ "پھر یہ بھی دیکھ لو کہ پولیس کی سر توڑ کوشش کے باوجود ضیغم خان کی لاش نہیں مل سکی تھی۔"

"تب پھر۔۔۔ تمہارے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ان تمام پچھلے برسوں میں یہاں کوئی بدروح نہیں تھی اور یہ سب کہانیاں خود ضیغم خاں نے پھیلائی ہیں؟"

"ہاں میرا اندازہ میں ہے۔" عنبر نے کہا۔ "ضیغم خاں زندہ و سلامت اپنے اس محل میں موجود ہے اور میں اس سے مل کریں پوچھنا چاہتا ہوں کہ آخر اُسے یہ سارا کھڑاگ پھیلانے کی کیا ضرورت پیش آئی؟"

"م۔۔۔ مگر۔۔۔ سوال یہ ہے کہ اگر ضیغم خاں واقعی اتنے برسوں سے اس محل

میں رہ رہا ہے تو اس کے آنے جانے، چلنے پھرنے اور کھانے پینے، رہنے سہنے کا کوئی تو نشان ہمیں ملنا چاہیے تھا؟" نسیم نے اعتراض کیا۔ "لیکن تم خود دیکھتے ہو کہ ایسا کوئی نشان اب تک ہمیں نہیں مل سکا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ ضیغم خاں کے کھانے پینے کا انتظام آخر کون کرتا ہو گا؟ کوئی شخص اتنے برس تک دنیا کی نگاہوں سے اپنے آپ کو چھپا کر نہیں رہ سکتا۔"

"یہی بات تو میں اس سے پوچھنا چاہتا ہوں۔" عنبر نے کہا۔ "بہر حال، یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ وہ لوگوں کو اپنے محل سے دور رکھنے کا خواہش مند ہے اور اس مقصد کے لیے اس نے بد روحوں اور بھُوتوں کا کھیل رچایا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ وہ کسی کو نقصان پہچانا نہیں چاہتا، سوائے ڈرانے اور خوف زدہ کرنے کے۔"

یکایک سُرنگ کے آخری سِرے پر ہلکی سی گڑگڑاہٹ کی آواز سنائی دی۔ عنبر اور نسیم دونوں ہولے ہولے آگے بڑھے۔ وہاں اب اتنا بڑا دروازہ نمودار ہو چکا تھا کہ وہ دونوں اس میں سے آسانی کے ساتھ گزر کر باہر نکل سکتے تھے۔ اب پیانو کی

آواز سارے محل میں گونج رہی تھی اور وہ پراسرار سُرمئی رنگ کا ناچتا ہوا دھواں غائب ہو چکا تھا۔ ان دونوں کے سُرنگ سے باہر جاتے ہی گڑگڑاہٹ کی آواز دوبارہ آئی۔ انہوں نے پلٹ کر دیکھا۔ دروازہ آپ ہی آپ دوبارہ اس طرح بند ہو گیا کہ غور سے دیکھنے کے باوجود دیوار پر اس کا کوئی ذرا سا نشان بھی نظر نہ آتا تھا۔

"یہ سب فنِ تعمیر کا کمال ہے۔" عنبر نے نسیم سے کہا۔ "ضیغم خاں نے محل بنواتے وقت یہ سب انتظامات کیے ہوں گے تاکہ وہ لوگوں کو حیران کر سکے۔"

اب وہ ایک چھوٹے سے صحن میں کھڑے تھے اور پیانو بجنے کی آواز ان کے دائیں جانب سے آ رہی تھی۔ ٹارچ کی روشنی اُدھر ڈالی تو معلوم ہوا کہ وہ میوزک روم کے عین سامنے کھڑے ہیں۔ عنبر نے فوراً ٹارچ بجھا دی۔ ان کے چاروں طرف گھُپ اندھیرا تھا۔ چند لمحے بعد جب ان کی آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو وہ دبے پاؤں میوزک روم کی جانب بڑھے۔ نسیم نے عنبر کے کان میں کہا: "تم نے ٹارچ کیوں بجھا دی؟ اندھیرے میں ٹھوکر کھا کر ہم میں سے کوئی

گِرا تو سخت چوٹ لگے گی۔"

"احتیاط سے چلو گے تو نہیں گرو گے۔" عنبر نے اسے سمجھایا۔ "ٹارچ جلانا اس وقت مناسب نہیں۔ ہم نیلے بھُوت کو بے خبری میں دبوچ لینا چاہتے ہیں؟ وہ صحن کی دیوار کے ساتھ ساتھ اندھوں کی طرح راستہ ٹٹولتے ہوئے میوزک روم کے دروازے تک پہنچ گئے۔ ان کے قدموں سے کوئی آواز پیدا بھی ہوئی تو وہ پیانو کی چیختی چنگھاڑتی آواز میں دب گئی ہو گی۔

میوزک روم کا دروازہ کھلا تھا۔ انہوں نے کمرے میں جھانکا۔ چھت اور فرش کے درمیان کچھ فاصلے پر نیلے رنگ کا ایک چمک دار، گول گول ستارہ سا ناچ رہا تھا۔ وہ کبھی تیرتا ہوا نیچے آتا، کبھی اوپر جاتا۔ عنبر نے اندازے سے ہاتھ بڑھا کر نسیم کے کندھے سے لٹکا ہوا کیمرا لے لیا۔ شاید وہ نیلے بھوت کی تصویریں اتارنے کا ارادہ کر رہا تھا۔

"اب تم ضیغم خاں کو آواز دو اور کہو کہ ہم دوست ہیں اور آپ سے چند ضروری باتیں کرنے آئے ہیں۔ ہمیں آپ کے تمام بھیدوں کا پتا چل گیا ہے۔ یہ سُن کر

ضیغم خاں کو ہمارے سامنے آنا پڑے گا اور جوں ہی وہ ہمیں دکھائی دے گا میں جھٹ سے اُس کی تصویر اُتار لوں گا۔ تم مہربانی کر کے ٹیپ ریکارڈر تیّار رکھو۔ ضیغم خاں کی آواز سنائی دے تو اسے بھی ریکارڈ کر لینا۔“

نسیم نے ایک دو مرتبہ کھنکار کر زور سے آواز دی:

”جناب ضیغم خاں صاحب، السلامُ علیکم۔ میں نسیم بول رہا ہوں اور میرے ساتھ عنبر بھی ہے۔ ہم دونوں آپ ملنا چاہتے ہیں۔ ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم آپ کے دوست ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ آپ خدا کے فضل سے زندہ سلامت ہیں۔ کیا آپ ہم سے ملاقات کرنا پسند کریں گے؟“

ابھی نسیم کی آواز میوزک روم میں گونج ہی رہی تھی کہ پیانو بجنا ایک دم بند ہو گیا۔ کمرے میں موت کی سی خاموشی چھا گئی۔ نیلے رنگ کا چمکتا ہوا ستارہ آہستہ آہستہ فرش سے چھت کی طرف جانے لگا۔ ایک منٹ تک وہ فضا میں جھولتا رہا، پھر اچانک بجھ گیا۔ چند لمحوں بعد انہوں نے محسوس کیا کہ میوزک روم میں ان کے علاوہ کوئی اور ہستی بھی موجود ہے۔ وہ اس کے قدموں کی آہٹ سن رہے

تھے۔ ان کے دل تیزی سے دھڑکنے لگے۔ عنبر کی انگلی کیمرے کے بٹن پر تھی اور نسیم ٹیپ ریکارڈ چالو کرنے ہی والا تھا کہ وہ نامعلوم ہستی ان سے کچھ فاصلے پر آن کر رُک گئی۔ اب اس کے سانس لینے کی ہلکی ہلکی آواز بھی آ رہی تھی۔ عنبر نے اندازہ کیا کہ شاید کمرے میں دو آدمی اور ہیں۔ تصویر اُتارنے کا ارادہ ملتوی کر کے اس نے ایک دم ٹارچ روشن کر دی۔ آنے والوں کو غالباً اچانک روشنی ہو جانے کی توقع نہ تھی۔ عنبر اور نسیم نے دیکھا کہ ان سے پانچ فٹ کے فاصلے پر دو آدمی عربوں کا سا لباس پہنے کھڑے ہیں۔ ایک کا قد لمبا تھا، دوسرے کا چھوٹا۔ ان نے ہاتھوں میں سفید رنگ کی کوئی بڑی سی چیز تھی۔ اس سے پہلے کہ عنبر اور نسیم سنبھل کر کوئی حرکت کر سکیں، ان دونوں نے وہی سفید سفید چیز اچانک ان کے سروں پر پھینک دی۔ یہ اصل میں نائیلون کی رسّی کا مضبوط جال تھا۔ جال پڑتے ہی عنبر اور نسیم نیچے گر پڑے۔ ٹارچ عنبر کے ہاتھ سے چھوٹ کر گری جسے ایک عرب نے جلدی سے اٹھا کر بجھا دیا۔ پھر آناً فاناً ان دونوں عربوں نے نسیم اور عنبر کو جال میں اچھی طرح لپیٹ کر کندھوں پر اُٹھا لیا اور ایک طرف چل

پڑے۔ اندھیرے میں بہت سے کمروں، برآمدوں، صحن اور سرنگوں میں سے ہوتے ہوئے دونوں عرب ایک کوٹھڑی کے قریب پہنچے۔ عنبر اور نسیم نے لوہے کی زنجیر کھلنے کی آواز سُنی، پھر لکڑی کا بھاری دروازہ کھلا۔ کوٹھڑی میں گھُپ اندھیرا تھا۔ یکایک ان میں سے ایک نے عنبر کو زمین پر پٹخ دیا۔ دوسرے نے نسیم کو اس کے اوپر پھینکا۔ پھر ایک چھوٹی سی لالٹین جلائی گئی۔ اس کی مدھم روشنی کوٹھڑی میں پھیل گئی۔ دونوں عرب وہاں سے جاچکے تھے اور کوٹھڑی کا دروازہ بند تھا۔

بھوتوں کی قید میں

دیر تک نسیم اور عنبر جال میں بندھے پڑے رہے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ایک دم یہ کیا ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد نسیم کی آواز آئی:

"سراغ رساں نمبر ایک، کیا حال ہے؟ زندہ ہو یا چل دیے؟"

"ابھی زندہ ہوں۔ تمہیں چھوڑ کر بھلا کہیں جا سکتا ہوں؟" عنبر نے جواب دیا۔

"اب سوچا کیا ہے تم نے؟ یوں ہی قیامت تک بندھے پڑے رہو گے؟" نسیم نے یہ فقرہ ایسی بے بسی سے کہا کہ عنبر کی ہنسی بے اختیار نکل گئی۔

”ہاں ہاں۔ خوب ہنسو۔ قہقہے لگاؤ، تم تو چاہتے ہی یہ تھے کہ کوئی آفت ٹوٹے مجھ پر۔“

”چپ چاپ پڑے رہو۔ مجھے امید ہے یہ لوگ ہمیں زیادہ دیر قید میں نہیں رکھ سکیں گے۔ عاقب اور اللہ داد ہماری تلاش میں ضرور اِدھر آئیں گے۔“

”اور آتے ہی وہ غریب بھی ہماری طرح دھر لیے جائیں گے۔ کیوں؟“ نسیم کا غصّہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

ممکن ہے ابھی وہ کچھ اور اول فول بکتا کہ کوٹھڑی کے باہر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ دونوں نے ایک دم، دم سادھ لیا۔ اتنے میں لوہے کی زنجیر ہٹائی گئی، لکڑی کا دروازہ چرچراتا ہوا کھلا اور لمبے قد والا آدمی اندر داخل ہوا۔ اس نے جلتی ہوئی لالٹین اٹھائی، اس کی بتّی اونچی کی اور ان دونوں قیدیوں کو باری باری جھک کر غور سے دیکھنے لگا۔ نسیم اور عنبر نے یوں ظاہر کیا جیسے بے ہوش پڑے ہوں۔ پھر اس شخص نے ان دونوں کے بال پکڑ کر زور زور سے جھٹکے دیے۔ اِن کی چیخیں نکل گئیں۔ اس شخص نے قہقہہ لگایا۔ اس کی پوری بتّیسی سونے کی تھی۔ لالٹین کی

روشنی میں اس کے دانت جگ مگ جگ مگ کر رہے تھے۔

”ارے او ننّھے مُنّے بے وقُوفو! تمھیں کتنی مرتبہ سمجھایا گیا کہ اس خطرناک جگہ سے دور رہو لیکن تمھارے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ ہاہاہاہا! تم اپنے آپ کو بہت چالاک سمجھتے تھے۔ اب کہاں گئی تمھاری وہ چالاکی اور ہوشیاری؟ بولو! جواب دو“!

عنبر اور نسیم خاموش رہے۔ اس شخص نے ایک اور خوف ناک قہقہہ لگا کر اپنی کمر میں بندھا ہوا انہایت لمبا اور چمک دار خنجر نکالا۔ نسیم کا خون رگوں میں جم گیا اور اس نے سہم کر آنکھیں بند کر لیں۔

”ارے بکری کے بچے! آنکھیں کھول!“ اس نے گرج کر کہا۔ ”میں تم دونوں کو یہیں کاٹ کر ڈال دوں گا۔ یہ بات دل سے نکال دو کہ میں تمھیں آزاد کر دوں گا تاکہ تم ساری دنیا میں اپنے کارنامے بیان کرتے پھرو۔ میں نے اب تک پچاس آدمی قتل کیے ہیں۔ تمھیں مِلا کر یہ تعداد باون ہو جائے گی۔“

”ج۔۔۔ جا۔۔۔ جن جناب ہمیں معاف کر دیجئے۔ خدا کے واسطے۔۔۔۔ ہم پر یہ

ظلم نہ کیجیے۔"

نسیم نے گڑگڑا کر کہنا شروع کیا۔"اس مرتبہ ہمیں چھوڑ دیجیے۔ ہماری توبہ۔۔۔ ہمارے باپ کی توبہ۔۔۔ پھر کبھی ہم اِدھر کا رُخ نہ کریں گے۔ ہم یہ بھی وعدہ کرتے ہیں کہ آپ کے بارے میں کسی سے ایک لفظ نہ کہیں گے۔"

"خاموش!" لمبے آدمی نے آنکھیں نکال کر اسے ڈانٹا "اب توبہ تِلا سب بے کار ہے۔ میں تم لوگوں کو کسی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتا۔ کان کھول کر سن لو، تم نے جرم ہی ایسا کیا ہے کہ اس کی سزا موت کے سوا اور کچھ نہیں۔ کیا مزے لے لے کر پلاؤ، زردہ اور قورمہ اُڑا رہے تھے جیسے تمہارے باپ دادا کا مال ہے۔ عبدل۔۔۔ ابے او عبدل۔۔۔۔ کہاں مر گیا۔ جلدی ادھر آ۔"

"آرہا ہوں جناب۔" کوٹھڑی کے باہر سے آواز آئی۔"ذرا چھُرا تیز کر رہا تھا۔"

یہ سن کر نسیم اور عنبر کے اوسان اور خطا ہوئے۔ اتنے میں چھوٹے قد والا آدمی وہی عربی لباس پہنے اور ہاتھ میں ایک فٹ لمبا چھُرا لیے نمودار ہوا۔

”کیا حکم ہے جناب؟“

”ثمینہ کہاں ہے اور وہ دوسری بڑھیا کدھر گئی؟“

”وہ دونوں خفیہ تہہ خانے میں موجود ہیں اور ہیرے چُن چُن کر تھیلیوں میں بھر رہی ہیں۔ انہیں بُلا دوں؟“

”نہیں۔ انہیں وہیں رہنے دو۔ ابھی تو ان کم بختوں کا تیا پانچا کرنا ہے۔“ لمبے آدمی نے اپنے سُنہری دانت پیستے ہوئے کہا۔

”جناب، میری مانیے تو انہیں ذبح کر کے محل کے صحن میں دفن کر دیتے ہیں۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو گی۔“

لمبے قد والا آدمی کسی گہری سوچ میں گم ہو گیا۔ اُدھر نسیم اور عنبر کے دلوں کی دھڑکن رُکی ہوئی تھی کہ دیکھیے وہ کیا فیصلہ کرتا ہے۔

تھوڑی دیر بعد لمبے آدمی نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ نہیں۔ یوں کام نہ چلے گا۔ ہمارے پاس اتنا وقت نہیں کہ پہلے ان کم بختوں کو قتل کریں، پھر اِن کی لاشیں

گاڑنے کے لیے کئی فٹ گہرا گڑھا کھودیں۔ تمہیں ابھی اپنی منزل پر روانہ ہونا چاہیے۔ ایسا کرو کہ اِن کے ہاتھ پاؤں اچھی طرح باندھ کر یہیں اس کال کوٹھڑی میں چھوڑ دو۔ جب کھانے پینے کو کچھ نہ ملے گا تو خود ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائیں گے۔"

"کیا عمدہ تدبیر سوچی ہے آپ نے۔ واہ واہ! مزا آ گیا۔" عبدل نے خوشی سے جھومتے ہوئے کہا۔ "اسے کہتے ایک پنتھ دو کاج، یعنی سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے گی۔" انہوں نے کوٹھڑی سے باہر نکل کر دروازہ بند کیا اور آپس میں باتیں کرتے ہوئے چلے گئے۔ لالٹین فرش سے اُٹھا کر انہوں نے دیوار میں لگے ہوئے لوہے کے ایک کڑے سے لٹکا دی تھی۔ جب ان کے قدموں کی چاپ مدھم پڑتے پڑتے غائب ہو گئی تب عنبر نے آہستہ سے کہا:

"ہیلو مسٹر نسیم، کیا حال چال ہے؟"

"وہی ہڈّی، وہی کھال ہے۔" نسیم نے تکلیف سے کراہتے ہوئے جواب دیا۔ "بہت مزے میں ہوں۔ تم اپنی کہو۔"

”میں بھی مزے میں ہوں۔“ عنبر نے کہا۔ ”خدا کا شکر ہے آسیبی محل اور ضیغم خاں کے بارے میں جو کچھ میں نے اندازے لگائے تھے وہ صحیح ثابت ہوئے۔“

نسیم نے کہا۔ ”میرے خیال میں تو یہ اسمگلروں کا کوئی گروہ ہے۔ تم نے سنا نہیں وہ کچھ ہیرے جواہر کی بات کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ دو عورتیں بھی ہیں۔ ایک کا نام ثمینہ ہے اور دوسری کوئی بڑھیا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ وہی عورت ثمینہ ہمیں آئینے کے فریم میں اپنی جھلک دِکھلا کر غائب ہوئی ہو۔“

”بھئی واہ! تمہارا دماغ اس وقت خوب کام کر رہا ہے۔“ عنبر نے خوش ہو کر اس کو شاباش دی۔ ”ویسے میرا اندازہ ہے کہ ابھی دو آدمیوں میں سے ایک ضیغم خاں خود ہے۔ خیر، اس موضوع پر بعد میں بحث ہو گی۔ یہ بتاؤ کہ کیا تم اپنے ہاتھوں کو حرکت دے سکتے ہو؟“

”میں صرف بائیں ہاتھ کی چھنگلیا ہلا سکتا ہوں۔“ نسیم نے جواب دیا۔ ”کم بختوں نے بہت بُری طرح باندھا ہے۔“ ”خوش قسمتی سے میں اپنا دایاں ہاتھ استعمال کر سکتا ہوں۔“ عنبر نے چُپکے سے کہا ”اور یہ بھی سُن لو کہ میں اتنی دیر سے بے کار

نہیں بیٹھا رہا ہوں۔ اپنی اور تمہاری آزادی کے لیے برابر کوشش کر رہا ہوں۔"

"کیسے جاؤ کوشش میرے دوستو۔" نسیم نے اُونچی آواز میں گانا شروع کر دیا۔

"یہ گانا بجانا رہنے دو اور بتاؤ کہ میں تمہاری رسیاں کدھر سے کاٹنا شروع کروں؟" عنبر نے کہا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ننّھا سا تیز دھار والا چاقو لالٹین کی روشنی میں چمک رہا تھا جسے وہ ہمیشہ بُرے وقت کے لیے اپنی پتلون کی پیٹی کے اندر چھپائے رکھتا تھا۔ اس چاقو کے آٹھ پھل تھے اور مختلف کاموں میں انہیں برتا جا سکتا تھا۔

نسیم بڑی مشکل سے ایک ایک انچ سِرک کر عنبر کے قریب آیا اور اس نے چاقو سے نسیم کے ہاتھوں پر بندھی ہوتی رسّی کاٹ دی۔ نسیم کے ہاتھ آزاد ہو گئے۔ اب اس نے چاقو لیا اور عنبر کے بند کاٹ ڈالے۔

یکایک انہوں نے کوٹھڑی کے باہر قدموں کی آہٹ سُنی۔ ایک سیکنڈ کے لیے وہ پتھر بن گئے۔ پھر عنبر نے جلدی سے کروٹ لی اور کٹی ہوئی رسی اپنے پیٹ کے نیچے چھپا لی اور گٹھڑی سی بن کر پڑا رہا۔ یہی حرکت نسیم نے کی۔ ان کے دل تیزی سے دھڑک رہے تھے۔

دروازہ کھلا اور کوئی اندر آیا۔ پھر ایک بھیانک ہنسی کی آواز اُن کے کانوں میں آئی۔ عنبر اور نسیم نے چور نظروں سے آنے والے کو دیکھا اور خوف کی نئی لہر اُن کی ریڑھ کی ہڈّیوں میں اُترتی چلی گئی۔

ان کے سامنے سو برس کی ایک بوڑھی چڑیل دانت نکالے کھڑی تھی۔ اس کا لباس گردن سے لے کر ٹخنوں تک کالا سیاہ تھا۔ لمبے لمبے اور الجھے ہوئے بال جھریوں پڑے چہرے پر جھُول رہے تھے۔ ناک طوطے کی چونچ کی طرح مُڑی ہوئی اور نوکیلی تھی اور آنکھیں لال انگارہ دہکتی ہوئی۔

"ننّھے مُنّے خرگوشو، کیا کر رہے ہو؟" بڑھیا نے اپنی مکروہ آواز میں کہا۔ "کیا تمہیں بتایا نہیں گیا تھا کہ اس محل کی طرف مت آنا۔ میں خود تمہارے گھر گئی تھی، لیکن تم نہیں مانے۔ اب اپنے کیے کی سزا بھگتو۔۔۔ آہا! تم خاصے مکّار دکھائی دیتے ہو۔"

یہ کہہ کر بڑھیا نے ایک لات عنبر کے رسید کی۔ دوسری نسیم کے، خدا جانے اس کمزور سو سالہ بڑھیا میں اتنی قوّت کہاں سے آگئی تھی۔ درد سے اُن دونوں کی

چیخیں نکل گئیں۔ بڑھیا نے اپنے گندے اور لمبے لمبے ناخنوں والے پنجوں سے ان کے جسموں پر بندھی رسّیاں ٹٹولیں۔ اسے فوراً پتا چل گیا کہ رسّیاں کٹ چکی ہیں۔ اس نے پھرتی سے ان کی تلاشی لی اور وہ چھوٹا سا چاقو برآمد کر لیا۔ پھر اُونچی آواز میں چِلّائی!

”عبدل۔۔۔ عبدل۔۔۔ چھرا لے کر آؤ۔ پنچھی پنجرے سے اُڑنے کے لیے تیّار ہیں۔“

بڑھیا کی چیخ پکار کے جواب میں باہر سے عبدل کے بجائے ایک عورت دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔ اس کا قد لمبا تھا۔ اس نے شوخ رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے اور ایک ہاتھ میں نائیلون کی بنی ہوئی لمبی مضبوط رسّی تھی۔

بڑھیا نے جھپٹ کر رسّی اُس کے ہاتھ سے چھین لی پھر پنجوں کے بل زمین پر بیٹھ کر عنبر اور نسیم کے ہاتھ پاؤں دوبارہ اچھی طرح کس کر باندھ دیے۔ ”یہ بدمعاش اب قیامت تک آزاد نہیں ہو سکتے۔ یہیں بھوک سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مریں گے۔“ یہ کہ کر وہ دونوں چلی گئیں۔

اللہ داد اور عاقِب گاڑی میں بیٹھے بڑی بے چینی سے عنبر اور نسیم کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔ جب خاصی دیر ہو گئی تو اللہ داد نے عاقِب سے کہا۔ ”عنبر میاں ضرور مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔ ہمیں ان کی مدد کے لیے چلنا چاہیے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔“ عاقِب نے کہا اور دروازہ کھول کر کار سے باہر نکل آیا۔ اللہ داد نے اپنی سیٹ کے نیچے سے ایک ہتھوڑا نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔ پھر ٹارچ اُٹھائی اور گاڑی کے دروازے بند کر کے دونوں بھوت محل کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ محل کے دروازے پر پہنچے تو دیکھا دروازہ بند ہے اور اس کا ہینڈل غائب ہے۔ اللہ داد نے ٹارچ جلائی۔ اچانک عاقِب کو بائیں طرف ایک چھوٹا خفیہ دروازہ نظر آیا۔ اس پر چاک سے ایک بڑا سا سوالیہ نشان بنا ہوا تھا۔ عاقِب نے فوراً کہا۔ ”عنبر اور نسیم اسی راستے سے اندر گئے ہیں۔“

اللہ داد اور عاقِب خفیہ دروازے سے اندر داخل ہوئے تو انہوں نے اپنے آپ کو کھانے کے ایک بڑے سے کمرے میں پایا۔ اس کے بہت سے دروازے تھے لیکن چاک کا سوالیہ نشان کسی دروازے پر نظر نہ آیا۔ وہ، سوچنے لگے اب کس

طرف جایا جائے؟ ابھی کوئی فیصلہ نہ کر پائے تھے کہ لکڑی کے چوکور فریم میں جڑے ہوئے بڑے آئینے پر نظر پڑی۔ فریم کے عین بیچ میں ایک سوالیہ نشان موجود تھا۔ اللہ داد نے آگے بڑھ کر فریم چھُوا۔ اتّفاق سے اس کا ہاتھ خفیہ کمانی پر جا پڑا۔ فریم کھٹاک سے دروازے کی طرح کھُل گیا اور سامنے ایک تنگ سی سُرنگ نظر آنے لگی۔ وہ دونوں بے دھڑک اس میں داخل ہو گئے اور آگے پیچھے چلتے ہوئے میوزک روم میں پہنچے۔ ٹارچ کی روشنی اِدھر ادھر ڈالی۔ ایک بوسیدہ کرسی کے نیچے کوئی سے چمکتی ہوئی نظر آئی۔ عاقِب نے آگے بڑھ کر اسے اُٹھالیا اور اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے حیرت کی ایک چیخ نکلی۔

"ارے! یہ تو نسیم کی ٹارچ ہے۔" انہوں نے غور سے فرش کو دیکھا بھالا۔ گرد میں قدموں کے کئی نشان نظر آ رہے تھے۔ ایک جگہ چاک سے سوالیہ نشان بنا ہوا تھا۔ قدموں کے نشانات کا کھوج لگاتے ہوئے وہ میوزک روم سے نکل کر ہال کمرے میں پہنچے۔ یہاں سے آگے ایک طویل راہ داری پھیلی ہوئی تھی اور داہنے ہاتھ کچھ سیڑھیاں نیچے تہہ خانے کی طرف جاتی تھیں۔ قدموں کے نشاں یہاں

کر غائب ہو گئے تھے۔

اچانک سب سے اوپر والی سیڑھی پر چاک کا سوالیہ نشان دکھائی دیا۔ خوشی کے مارے دونوں بے اختیار اُچھل پڑے اور تیزی سے نیچے اُترے۔ آخری سیڑھی پر بھی چاک کا سوالیہ نشان موجود تھا۔

سامنے تین سرنگیں سی نظر آرہی تھیں اور ہر سرنگ گھُپ اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ انہوں نے ٹارچ کی روشنی میں اِدھر اُدھر بہت تلاش کیا مگر چاک کا کوئی اور سوالیہ نشان دکھائی نہ دیا۔ اچانک گڑگڑاہٹ کی آواز سنائی دی۔ اتنے میں پہلی سُرنگ میں روشنی سی ہوئی اور ایک عورت کا چہرہ دکھائی دیا۔ اس نے لالٹین اٹھا رکھی تھی۔ اللہ داد اور عاقِب کو دیکھ کر وہ تیزی سے پیچھے مُڑی اور سُرنگ میں غائب ہو گئی۔

وہ دونوں اس کے پیچھے لپکے۔ لیکن یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہاں اب کوئی سُرنگ موجود نہیں۔ اس کے بجائے سیمنٹ کی ایک دیوار اُن کا راستہ روکے کھڑی تھی۔ اللہ داد نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، جھنجھلا کر سیمنٹ کی دیوار پر دھڑا دھڑ

ہتھوڑے برسانے شروع کر دیے۔ تین چار ضربوں کے بعد انہیں احساس ہوا کہ دیوار ایک مقام پر سے کھوکھلی ہے۔ اس نے ہتھوڑے سے چند ضربیں اور لگائیں تو اس مقام پر خاصا چوڑا شگاف ہو گیا۔

وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے احتیاط سے آگے بڑھنے لگے۔ اچانک عاقِب کا پاؤں پھسلا اور ٹارچ اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا پڑی اور بجھ گئی۔ سُرنگ میں گہری تاریکی چھا گئی۔ اللہ داد اور عاقِب اندھوں کی طرح ہاتھوں سے ٹٹول ٹٹول کر ٹارچ تلاش کرنے لگے۔ ایکا ایکی عاقِب کو اپنے چہرے کے قریب کسی جان دار شے کی موجودگی کا احساس ہوا۔ کوئی نرم نرم سی شے بڑے زور سے اُس کے سر سے آن ٹکرائی۔ پھر دوسری۔۔۔ پھر تیسری۔ عاقب ڈر کے مارے زور زور سے چیخنے لگا۔ ”اللہ داد، بچاؤ! چمگادڑیں! ہائے چمگادڑیں“!

عاقِب کی چیخ پُکار نے پل بھر کے لیے تو اللہ داد کے بھی اوسان خطا کر دیے، لیکن آدمی جی دار تھا۔ جلد ہی اپنے حواس پر قابو پا لیا اور ٹارچ تلاش کرنے لگا۔ ٹٹولتے ٹٹولتے اس کا ہاتھ اچانک ٹارچ پر جا پڑا۔ اس نے فوراً اُسے روشن کیا۔ کیا دیکھتا

ہے کہ بے شمار پرندے چیختے چلاتے سُرنگ میں اُڑ رہے ہیں۔ اس نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ یہ خون پینے والی چمگادڑیں نہیں تھیں بلکہ بے ضرر اور معصوم طوطے تھے۔ لمبی لمبی دُموں والے رنگ برنگ، خوب صورت طوطے۔

اللہ داد نے آگے بڑھ کر عاقِب کا ہاتھ پکڑا اور آہستہ آہستہ واپس سُرنگ کے دروازے کی طرف رینگنے لگا۔ باہر نکل کر اللہ داد نے سُرنگ کا دروازہ مضبوطی سے بند کر دیا تا کہ پرندے باہر نہ آ سکیں۔ اچانک انہیں کچھ شور سا سنائی دیا۔ کان لگا کر غور سے سنا تو ایسا محسوس ہوا سے کوئی زور زور سے مدد کے لیے پکار رہا ہے۔ آواز عنبر کی معلوم ہوتی تھی اور برابر والی راہداری کے ایک کمرے سے آ رہی تھی۔ وہ تیزی سے اُدھر لپکے۔ ایک تاریک کمرے میں عنبر اور نسیم گٹھڑی بنے پڑے تھے۔ اللہ داد نے جیب سے چاقو نکالا اور جلدی جلدی ان کی رسّیاں کاٹیں۔ وہ کپڑے جھاڑ کر اُٹھ بیٹھے۔ اللہ داد بولا:

”ہمیں فوراً پولیس کو خبر کرنی چاہیے۔ یہ خطرناک لوگوں کا گروہ معلوم ہوتا ہے۔“

عنبر نے کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن جیسے ہی عاقِب نے سرنگ میں طوطوں کے حملے کا ذکر کیا اس کے کان کھڑے ہو گئے۔

"اب سمجھا۔۔۔ آؤ میرے ساتھ۔" یہ کہہ کر اس نے ٹارچ روشن کی اور دروازہ کھول کر تیزی سے سُرنگ کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ اللہ داد، نسیم اور عاقِب بھی خاموشی سے اس کے پیچھے ہو لیے۔

سرنگ کے دوسرے سِرے پر لکڑی کا ایک کھُلا دروازہ دکھائی دیا۔ دوسری طرف بے شمار رنگ برنگ طوطوں نے اُدھم مچا رکھا تھا۔ عنبر دوڑتے دوڑتے رک گیا۔

"ارے! یہ تو لوہے کے تاروں کا وہ بڑا سا پنجرا ہے جس میں شاہ باز خاں نے اپنے طوطے پال رکھے ہیں۔ ہم اس وقت پہاڑی سڑک کے آخری موڑ پر پہنچ چکے ہیں۔ یہاں سے شاہ باز خاں کا بنگلا زیادہ دور نہ ہو گا۔" عنبر اور اللہ داد نے زور لگا کر کسی نہ کسی طرح پنجرے کے چند تار کاٹ کر ایک طرف سے گزرنے کا راستہ بنا لیا۔ اور ایک ایک کر کے سب اس راستے سے باہر کھلی فضا میں آ گئے۔ وہ

تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ سامنے شاہ باز خاں کا بنگلا نظر آگیا۔ کھڑکی میں بیٹھے دو آدمیوں کے سر صاف نظر آ رہے تھے۔ ایک تو شاہ باز خاں تھا اور دوسرا کوئی چھوٹے قد کا آدمی جس کے سر پر بالوں کا جنگل سا اُگا ہوا تھا۔

دروازے پر پہنچ کر انہوں نے دستک دی۔ چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر دروازہ کھلا۔ دروازہ کھولنے والا خود شاہ باز خاں تھا۔ عنبر اور اللہ داد کو دیکھ کر وہ بدحواس ہو گیا لیکن سنبھل کر بولا:

"آیئے آیئے، اندر تشریف لے آئیں۔"

شاہ باز خاں کا ساتھی بدستور کرسی پر بیٹھا رہا۔ اس کا قد بمشکل پانچ فِٹ ہو گا۔ اس نے اُن لڑکوں کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ شاہ باز خاں نے کہا:

"میں اپنے دوست کا تعارف آپ سے کراتا ہوں۔۔۔"

"جی نہیں۔ رہنے دیجیے۔ ہمیں معلوم ہے آپ دونوں کون ہیں۔" عنبر نے کہا۔ "اب سارا کھیل ختم ہو گیا ہے اور فریب دینے کی کوشش نہ کیجیے۔"

شاہ باز خاں اور اس کے ساتھی کا منہ فق ہو گیا۔ اس نے کہا۔ ”میں سمجھا نہیں، تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“

”جناب، میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ کھیل ختم ہو گیا۔ اب یہ بہروپ بدل ڈالیے۔ آپ ہی ضیغم خاں ہیں اور ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ نے اور آپ کے اس دوست نے ہمیں بھُوت محل میں گرفتار کر کے رسّوں سے باندھا تھا؟“

شاہ باز خان نے اطمینان سے کہا۔ ”بہت خوب! اس الزام کا کوئی ثبوت؟“

”جی ثبوت موجود ہے۔ اپنے جوتوں پر نظر ڈالیے۔ جب آپ دونوں بڑھیا اور ثمینہ کا بھیس بدل کر ہمیں رسّوں سے باندھ رہے تھے تو میں نے چُپکے سے آپ کے جوتوں پر چاک سے سوالیہ نشان بنایا تھا۔ دیکھ لیجیے۔ وہ نشان اب بھی موجود ہے۔“

شاہ باز خاں اور اس کے دوست کی نظریں بے اختیار اپنے جوتوں پر پڑیں۔ واقعی ان کے ایک ایک جوتے پہ سفید چاک سے سوالیہ نشان بنا ہوا تھا۔

کھودا پہاڑ، نکلی چوہیا

دیر تک ان کے منہ سے کوئی بات نہ نکلی۔ دونوں کچھ شرمندہ سے ہو گئے تھے۔ عنبر اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا۔ "تہہ خانے میں جب یہ ہمارے ہاتھ پیر باندھ رہے تھے تو میں نے ان کے جوتے ٹٹول کر دیکھے تھے۔ وہ مردانہ جوتے تھے۔ میں اسی وقت سمجھ گیا کہ یہ دونوں مرد ہیں اور انہوں نے صرف ہمیں دھوکا دینے کے لیے عورتوں کے کپڑے پہن رکھے ہیں۔ صرف یہی نہیں، اب میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ کہ اپنی مہم کے دوران میں بدمعاشوں کے گروہ کے جن پانچ آدمیوں سے ہمارا سامنا ہوا وہ حقیقت میں یہی دو آدمی

ہیں۔"

"کیا۔۔۔؟ تمہارا مطلب ہے وہ عرب اور اس کا ساتھی، بڑھیا چڑیل اور خانہ بدوش لڑکی۔۔۔ سب کے سب یہی شاہ باز خاں اور ان کا دوست تھے!" نسیم نے حیرت سے پوچھا۔

"بالکل۔" عنبر مُسکرایا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، شاہ باز خاں بول اُٹھا:

"ہاں دوستو، عنبر میاں ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ہم دو آدمیوں نے ہی باری باری پانچ مختلف آدمیوں کا بھیس بدلا۔ ہمارے پاس ہر طرح کی پوشاک اور کپڑے موجود ہیں اور ہمیں ایک لباس اُتارنے اور دوسرا پہننے میں مشکل سے چند منٹ لگتے ہیں۔ سچ بات یہ ہے کہ ہمارا ارادہ آپ کو کسی قسم کا نقصان پہنچانے کا ہرگز نہ تھا۔"

اتنا کہہ کر شاہ باز خاں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ایک کمرے کی طرف بڑھا اور دروازہ کھول کر اندر غائب ہو گیا ایک منٹ بھی نہ گزرا تھا کہ دروازہ دوبارہ کھلا لیکن باہر آنے والا شخص شاہ باز خان نہیں تھا۔ اس کا قد اس سے کچھ چھوٹا تھا اور صحت بھی

اچھی نظر آتی تھی۔ اس کے بال بڑی خوب صورتی سے سنوارے گئے تھے۔ اس نے موٹے کپڑے کی ایک خوب صورت جیکٹ پہن رکھی تھی۔ وہ عنبر اور اس کے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر مُسکرایا اور بولا۔ "سناؤ دوستو، کیا حال چال ہے۔ میرا نام ضیغم خان ہے۔ تم مجھ سے ملنا چاہتے تھے۔ کہو، کیا بات ہے؟"

کسی کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکلا۔ خاموش اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے گھورتے رہے۔ آخر شاہ باز خاں کے ٹھگنے دوست نے خاموشی توڑی اور بولا:

"ننّھے ساتھیو۔ انہیں اچھی طرح دیکھ لو۔ یہی ضیغم خاں ہیں۔"

"نہیں!" نسیم حیرت سے چلّایا۔ "نا ممکن! اس کا قد چھوٹا ہے۔ پھر سر پر بال بھی ہیں۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو میرے دوست!" ضیغم خاں نے مُسکراتے ہوئے کہا۔ پھر اچانک بالوں کو پکڑ کر جو ایک ہلکا سا جھٹکا دیا تو نقلی بالوں کی ٹوپی ہاتھ میں آ گئی اور گنجا سر چمکنے لگا۔ اب وہ بالکل سیدھا کھڑا ہوا تو اس کا قد لمبا دکھائی دینے لگا۔ اس کے ساتھ ہی وہ ایک خوف ناک آواز میں جو سانپ کی پھنکار سے ملتی جلتی تھی،

پکارا:

"خبردار! جو کسی نے حرکت کی۔ خاموشی سے اپنی اپنی جگہ کھڑے رہو!"

اتنا کہہ کر ضیغم خاں نے میز کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور بولا۔ "یہ آواز سُن کر بھی یقین نہیں آیا کہ میں ضیغم خاں ہی ہوں، جو ڈراموں اور فلموں میں خوف ناک بھُوتوں کا پارٹ ادا کیا کرتا تھا۔"

یہ کہہ کر اس نے جیب سے ایک عجیب سی شے نکالی۔ یہ پلاسٹک سے بنا ہوا مصنوعی زخم کا نشان تھا۔ وہ اسے لڑکوں کو دکھاتے ہوئے بولا۔ "یہ نشان جب میں اپنے گلے پر چپکا لیتا ہوں تو ضیغم خاں سے شاہ باز خاں بن جاتا ہوں۔ میری آواز شروع سے بہت خراب تھی۔ لوگ میری آواز سُنتے ہی بے اختیار ہنسنا شروع کر دیتے تھے۔ جب تک خاموش فلموں کا دور رہا مجھے آواز کی ضرورت نہ پڑی اور میں کامیاب ایکٹر رہا۔ لیکن جب بولنے والی فلموں کا رواج ہوا اور تماشائیوں نے میری آواز سُنی تو انہوں نے میرا خوب مذاق اڑایا۔ میں اپنی یہ بے عزّتی برداشت نہ کر سکا اور سب کام چھوڑ چھاڑ گھر میں بند ہو کر بیٹھ گیا۔ انہی

دنوں مجھے پہاڑی کے دامن میں یہ مکان نہایت سستے داموں مل گیا۔ یہاں آیا تو پتا چلا کہ یہاں سے میرے محل تک ایک خفیہ سرنگ بنی ہوئی ہے۔ دنیا سے کنارہ کش ہونے کے بعد میں اکثر شام کے وقت تنہا گاڑی میں سیر کرنے نکل جاتا۔ ایک روز سیر کرتے کرتے اچانک خیال آیا کہ اگر میں جھوٹ مُوٹ کا حادثہ ظاہر کر کے خود غائب ہو جاؤں تو کیسا رہے؟ محل میں واپس آنے کے بعد میں نے فوراً ہی اس منصوبے پر عمل کرنے کا پروگرام بنایا۔ پہلے ایک رقعہ لکھ کر ایسی جگہ رکھا جہاں محل میں داخل ہونے والے کی نظر اس پر پڑنی یقینی تھی۔ پھر میں نے اندھیری طوفانی رات میں پہاڑی چوٹی پر سے خالی گاڑی کو دھکیل کر نیچے گرایا اور اُسے آگ لگا دی۔ اس طرح ضیغم خاں کو دنیا کی نظروں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے موت کی نیند سلا دیا۔ دوسری طرف میں اپنا شان دار محل بھی اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا۔ یہ خالی تھا اور میں اپنے پہاڑی والے نئے مکان سے خفیہ سُرنگ کے راستے جب جی چاہتا وہاں آ جا سکتا تھا۔

یہ محل میں نے بڑی محنت اور خرچ سے بنوایا اور دنیا جہان سے طرح طرح کی

ڈراؤنی چیزیں خرید کر یہاں اکٹھی کیں، اپنے دوستوں کو اچانک ڈرانے اور اپنا جی بہلانے کی خاطر۔ لیکن اب یہی چیزیں لوگوں کو محل سے دور رکھنے کے لیے کام آئیں اور وہ سمجھنے لگے کہ یہ محل آسیب زدہ ہے۔ سب سے پہلے یہاں بینک والے آئے۔ میں نے بھُوت کا روپ بھر کر انہیں ڈرایا اور وہ بھاگ نکلے۔ اس سے اِرد گِرد کے لوگوں کے دلوں پر دہشت بیٹھ گئی۔

میرا منصوبہ کامیاب رہا۔ ڈر کے مارے کسی کو اس محل کو خریدنے اور یہاں آباد ہونے کی جرأت نہ ہوئی۔ لیکن پھر تم لوگ آدھمکے اور تم دوسروں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ضدّی اور بہادر ثابت ہوئے۔ اپنے پروگرام کے مطابق میں نے تمہیں بھی طرح طرح کے طریقوں سے ڈرانے اور خوف زدہ کر کے محل سے دور رکھنے کی کوشش کی مگر تم نے ہمّت نہ ہاری اور آخر کار میرا راز جاننے میں کامیاب ہو گئے۔ میرا دوست بوڑھی چڑیل کا روپ دھار کر تمہارے گھر بھی گیا تھا۔"

"اور آپ کی اسی حرکت نے مجھے ٹھیک راستے پر ڈالا۔" عنبر تیزی سے بولا۔

”میں نے سوچا آخر بھوت کو کسی کے ہاتھ پیغام بھجوا کر ہمیں ڈرانے کی کیا ضرورت۔ پھر محل کی تلاشی کے دوران ہمیں فولادی ڈھانچہ دیکھا تو وہ زیادہ زنگ آلود نظر نہ آیا۔ لائبریری میں بھی کچھ زیادہ۔ خاک دھول نہ تھی۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ کوئی خفیہ طور پر یہاں کی نگرانی اور حفاظت کر رہا ہے۔ اور ظاہر ہے وہ شخص محل کے مالک کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا۔ چنانچہ میں سمجھ گیا کہ آپ زندہ ہیں۔ لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ نیلا چمک دار شعلہ اور دھوئیں کے بادل کس طرح پیدا ہوتے تھے اور خوف اور ڈر پیدا کرنے والی تھرتھراہٹ کیونکر محسوس ہوتی تھی؟“

ضیغم خاں مُسکرایا۔ ”یہ باتیں میرا راز ہیں۔ مجھے ان پر سے پردہ اُٹھانے کے لیے مجبور نہ کریں۔ جادُوگر اپنے کرتبوں کے بارے میں اگر تماشائیوں کر ساری باتیں بتادے تو پھر تماشے کا سارا مزہ جاتا رہتا ہے۔ لیکن پھر کبھی مختصر الفاظ میں ایک دو باتیں بتائے دیتا ہوں۔ نیلا شعلہ اور دھوئیں کے بادل سائنسی شعبدوں کے سوا کچھ نہیں ہیں۔ نیلا شعلہ جو تم لوگوں نے ایک کمرے میں دیکھا تھا وہ ایک

بڑی سی گیند ہے جس پر گاڑھے نیلے رنگ کے فاسفورس کا لیپ کر دیا گیا تھا، اور تم جانتے ہو کہ فاسفورس اندھیرے میں چمکتا ہے۔ اندھیرے میں یہ گیند جب چمکتی تو دیکھنے والوں کو یوں محسوس ہوتا جیسے ہوا میں کوئی شعلہ ناچ ہے۔ رہے دھوئیں کے بادل تو وہ ایک خاص قسم کی گیس تھی جو اندر کے کمروں سے سُرنگ اور ہال میں بڑے بڑے پمپوں کے ذریعے پھینکی جاتی تھی۔ چوری چھپے محل کے اندر داخل ہونے والوں کے جسم میں ڈر اور خوف کی تھرتھری پیدا کرنے کے لیے بھی ایک خاص سائنسی طریقہ اختیار کیا جاتا تھا لیکن اس وقت میں اس کی تفصیل بیان نہیں کروں گا۔"

اپنی بات ختم کر کے ضیغم خاں اداس ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک کمرے میں گہری خاموشی چھائی رہی۔ پھر اس نے گلا صاف کر کے دوبارہ کہنا شروع کیا۔

"میں عرصے تک اس محل میں اپنی من مانی کرتا رہا۔ طرح طرح کے بھیس بدل کر لوگوں کو ڈراتا اور خوش ہوتا تھا۔ لوگوں کو خواہ مخواہ ڈرانا اور خوف زدہ کرنا اگرچہ کوئی اچھی بات نہیں لیکن کیا کرتا۔ میں اپنی عادت سے مجبور تھا۔ طویل

عرصے تک فلموں میں کام کرنے کی وجہ سے بھوتوں اور چڑیلوں کا بھیس بدلنے کا چسکا سا پڑ گیا تھا۔ لیکن افسوس اب یہ مشغلہ بھی ترک کرنا پڑے گا۔ تم لوگوں نے مجھے تباہ کر ڈالا۔"

"گھبراتے کیوں ہیں آپ۔ میرے ذہن میں ابھی ابھی ایک تجویز آئی ہے۔ آپ بڑی آسانی سے اپنا مشغلہ جاری رکھ سکتے ہیں۔" عنبر نے کہا۔

"وہ کیا تجویز ہے؟ ذرا میں بھی تو سنوں۔" ضیغم خاں بولا۔

"میرا خیال ہے، آپ بینک سے اپنا محل خرید لیں۔ یہ آسیب زدہ مشہور ہے اس لیے آپ کو کم قیمت پر مل جائے گا۔ پھر ہال کمرے میں ایک سٹیج بنوائیں اور اپنی پرانی خاموش فلموں کے چند حصّوں کی نمائش شروع کر دیں۔ اخبار آپ کی واپسی کی خبر خُوب نمک مرچ لگا کر شائع کریں گے۔ اس طرح مُفت میں آپ کا نام دُور دُور تک مشہور ہو جائے گا اور لوگ اور اس کے پراسرار مالک کو دیکھنے دھڑا دھڑ آنے لگیں گے۔ آپ محل کی سب چیزوں کو ایسے ہی رہنے دیں، بلکہ ہو سکے تو ان میں کچھ اضافہ بھی کر لیں اور محل میں لوگوں کے داخلے کا ٹکٹ لگا دیں کہ وہ

آئیں اور یہاں کے پراسرار اور خوف ناک عجائبات اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور مصنوعی ڈر اور خوف کا تجربہ کریں۔ اس طرح لوگوں کو اپنی طرز کی ایک بالکل نئی اور انوکھی تفریح میسر آ جائے گی۔ آپ کا شوق بھی پورا ہوتا رہے گا اور آمدنی کا ایک ذریعہ بھی نکل آئے گا۔ کیا خیال ہے؟ ہے نا عمدہ اور انوکھی تجویز؟"

"سو فی صدی عمدہ تجویز ہے۔" ضیغم خوشی سے چلّایا۔ "تم نے میری ایک بہت بڑی مشکل حل کر دی۔"

ختم شد